رَہ نوَردِ شوق

حیاتِ مبارکہ پیر سید محمد علی شاہؒ

مؤلف: سید مشتاق حُسین بخاری

رَہ نوَردِ شوق

حیاتِ مبارکہ پیر سید محمد علی شاہؒ

مؤلف: سید مشتاق حُسین بخاری

ایک روحانی تجربہ

یہ جو انسان کے اندر ایک تاریک براعظم سانس لے رہا ہے اسی کی بھول بھلیوں میں کہیں آگہی کا وہ بحرِ بیکراں بھی موجود ہے جس تک پہنچنے کے لئے صرف ذہن، جذبات و احساسات اور جسمانی قوت کو یکجا کر کے اور خاموشی کی بکل مار کر تخیل کے زور پر رسائی کی کوشش نہیں کرنا پڑتی۔ بلکہ پہلے مرحلے میں باہر کی دنیا میں ظاہر و مخفی ان شناوروں کی قدم بوسی کے لئے در بہ در بھٹکنا بھی پڑتا ہے میں جب ''رہ نورد شوق'' کا مطالعہ کر رہا تھا جو بظاہر تو سید مشتاق حسین بخاری نے اپنے والد بزرگوار ''پیر سید محمد علی شاہؒ'' کی سوانح عمری لکھی ہے مگر یہ اس دور اور بزرگانِ پیر سباک کا ایک عمدہ تذکرہ بھی ہے اور اس دنیا کی سیر بھی جو صرف نفس مطمئنہ کی انگلی پکڑ کر ہی دیکھی جاسکتی ہے۔ پیر صاحب موصوف نے بھی نظر آنے والے دنیا میں سفر کئے اور ان شناوروں کو ڈھونڈ نکالا جن کے دست شفقت نے ان کو باطن میں موجزن خودشناسی اور آگہی کے بحر بیکراں تک پہنچنے میں مدد دی۔ وہاں سے سرخرو ہو کر ان کی واپسی نے ان کو مخلوقِ خدا کے لئے سراپا دعا اور صلح کل بنا دیا۔ یہ جو ہمارے ارد گرد ایک اور دنیا موجود ہے جس کی ایک جھلک کبھی کبھی ہمیں اچانک نظر آجاتی ہے یہ ایسی پارسا اور برگزیدہ ہستیوں کا مستقل مسکن بن جاتی ہے۔ رہ نورد شوق کا مطالعہ میرے لئے کسی روحانی تجربہ سے کم نہیں ہے۔ مانو، خود سے ملنے، یکسوئی اور مراقبہ کے لئے کسی نسخۂ کیمیا سے کم نہیں۔

ناصر علی سید۔ پشاور

1437ھ کے رمضان کی تیسری سحری

رَہ نوردِ شوق

سوانح عمری

پیر صاحب سید محمد علی شاہؒ

”یکے از بزرگانِ ساداتِ پیر سباک“

(مؤلف)

سید مشتاق حسین بخاری

نام کتاب : رَہ نوردِ شوق

اشاعت : اول

تعداد : 300

کمپوزنگ : عثمان سعد

ترتیب وتدوین : مدثر زیب

قیمت : ذوقِ مطالعہ

تاریخ اشاعت : جون 2016ء

طابع : دی پرنٹ مین پرنٹرز اینڈ پبلشرز پشاور

فون:091-5286178

سلطان ٹیپو کی وصیت

تُو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جُوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تندوتیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز، گرمیِ محفل نہ کر قبول

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دُوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

(علامہ اقبالؒ)

عرضِ مؤلف

تعلیم کی ایک Definition یہ بھی ہے کہ ماضی میں حاصل کیے گئے علم اور حاصل شدہ معلومات کو نئی نسل کی طرف بحفاظت منتقل کیا جائے۔ چنانچہ ہماری نسل پر یہ فرض بنتا ہے کہ آنے والی نسلوں کو ہم پچھلی نسل کی شخصیات، اُن کے کارہائے نمایاں اور ان کی زندگی کی انسانی عظمت کی مثالیں منتقل کر دیں۔ یہ گویا اپنی تاریخ کو محفوظ کر کے اُسے اگلی نسل تک پہنچانے کا عمل بھی ہے اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ کوئی قوم یا نسل اپنے ماضی کے تاریخی تجربے کے بغیر مستقبل کا لائحہ عمل مرتب نہیں کر سکتی۔ اور اگر کوئی نسل ماضی کے ساتھ رشتہ جوڑے بغیر حال یا مستقبل کا لائحہ عمل طے کرے گی تو یہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے مترادف ہوگا۔

کتاب ''رہ نوردِ شوق'' دراصل ایک بہت بڑی کوتاہی کا ازالہ ہے۔ حضرت پیر صاحب کو اس دار فانی سے رخصت ہوئے تیس سال سے زائد کا عرصہ ہو گیا ہے مگر ہماری کوتاہی دیکھیے کہ ہم پیر صاحب کی سیرت و شخصیت پر ان سالوں میں سوائے چند ایک اخباری کالموں کے کچھ بھی محفوظ کر کے پیش نہ کر سکے۔ اس عرصے میں پیر صاحب مرحوم کے ہم عصر دوست، علماء، عمائدین، اُن کے معتقدین اور ان پر جان نچھاور کرنے والے احباب ایک ایک کر کے ہم سے رخصت ہوتے رہے اور یوں ہم اُن سے پیر صاحب کے بارے میں حاصل ہو سکنے والی قیمتی معلومات سے محروم رہ گئے۔ بہر حال دیر آید درست آید کے مصداق راقم نے کسی حد تک اُس کوتاہی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کوشش میں راقم کو سب سے پہلے اپنے خاندان کے افراد سے رجوع کرنا پڑا اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ مجھے توقع سے زیادہ مثبت ردِ عمل ملا اس کا ثبوت اس کتاب کے مندرجات سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ میرے برادران، میری برادری کے عمزاد اور خالہ زاد بھائیوں، نوجوان بھتیجوں اور پیر صاحب کے جاننے اور چاہنے والوں کی دوسری نسل نے جس خوش اسلوبی سے اس فرض کو نبھایا میں تہہ

دل سے اُن کا مشکور ہوں۔ لگے ہاتھوں کتاب میں پیر صاحب مرحوم کے ذکر کے علاوہ اُن شخصیات کا بھی ذکر آ گیا جن سے پیر صاحب مرحوم کا کسی نہ کسی طریقے سے تعلق رہا ہے۔ یہ تعلق اُن کے آباو اجداد، اُن کی برادری اور رشتہ دار، ان کے مرشد اور سلسلہ نسبت کی شخصیات، ان کے ہم عصر بزرگ، حتیٰ کہ اُن کی قابل احترام زوجین اور اولاد کا ذکر بھی آ گیا ہے۔

اسی طرح کتاب کے مندرجات میں خصوصی طور پر پیر صاحب کے زیر مطالعہ کتب اور ذخیرہ کتب کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس کام میں راقم کو خاصی محنت کرنی پڑی ہے کیونکہ قدیم عربی، فارسی، اُردو، پنجابی، پشتو کتب کے مصنفین اور سن طباعت کا ڈھونڈنا خاصا وقت طلب مرحلہ تھا۔ تاہم اُس مرحلے کو طے کرتے ہوئے بہت سی معلومات بھی حاصل ہوئیں اور ساتھ ہی قدیم عرصے سے پڑی ہوئی کرم خوردہ اور بوسیدہ کتب کو نئے اہتمام سے سنبھال کر ایک بہتر جگہ پر محفوظ کر دیا گیا۔ کتاب کی تالیف کے دوران سب سے پہلے تو کتاب میں درج مضامین کے مصنفین کا میری اُمید سے بڑھ کر رسپانس میرے لیے حوصلہ افزائی کا باعث بنا۔ بقول شاعر

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر　　لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میری اس پیشکش کو کتابچے سے پوری سوانح عمری کی شکل ملنے تک مرتب ہو جانے میں انہی مہربانوں کا کمال ہے۔ میں پیر صاحب کے متعلقین، عقیدتمندوں، ہم عصر بزرگوں کی اولاد کے نام گنوائے بغیر ان کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے میری اس تصنیف کے لیے اپنے بزرگوں کی تصاویر اور مطلوبہ معلومات مجھ تک پہنچانے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کو تالیف کرنے کا قصد دو سال قبل ہو چکا تھا اور اتنا ہی پہلے کتاب پر کام کا آغاز ہو چکا تھا، مگر جُوں جُوں آگے جاتے نئے اور اچھوتے خیالات اور حقائق سامنے آتے گئے اور نئے مواد کو شامل کرنا وقت کا تقاضا تھا۔ لہٰذا احباب میری اس فروگزاشت کو اس خیال سے نظر انداز کریں گے کہ

ہوئی جو تاخیر تو کچھ وجہ تاخیر بھی تھی

اس تمام تر محنت کے باوجود کتاب میں اب بھی بہت سی کمیاں باقی رہ گئی ہیں چند تصاویر عین آخری وقت پر کمپیوٹر سے delete ہو گئیں اور کچھ اہم معلومات اس مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گئیں۔ قارئین کرام سے التجا ہے کہ اس قسم کی کوتاہیوں کو میرے علم میں ضرور لائیں تا کہ اگلے کسی ایڈیشن میں اس میں تصحیح اور اضافہ ہو سکے۔

کتاب کے نام کے انتخاب کے وقت کتاب میں شامل محترم الطاف حسین شاہ صاحب کے مضمون پر نظر پڑی تو اس کا عنوان میرے دل کو بھی بھا گیا۔ الفاظ ’’رہ نورد شوق‘‘ علامہ اقبال کی ایک نظم کا حصہ ہیں جو ہمارے ممدوح پیر صاحب کی حیات و سیرت سے مماثل ہیں چنانچہ اس تالیف کا یہی نام تجویز ہوا۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس حقیر سی پیشکش کو جو ہم نے اپنے والد اور اس سب سے بھی بڑھ کر اللہ کے ایک نیک بندے کی یادوں کو اجاگر کرنے اور آنے والی نسلوں کو ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنے کے لیے پیش کی ہے قبول فرمائے۔

سید مشتاق حسین بخاری

07 جون 2016ء

یکم رمضان 1437 ہجری

فہرست مضامین

میرے والد مرحوم

پیر صاحب سید محمد علی شاہؒ

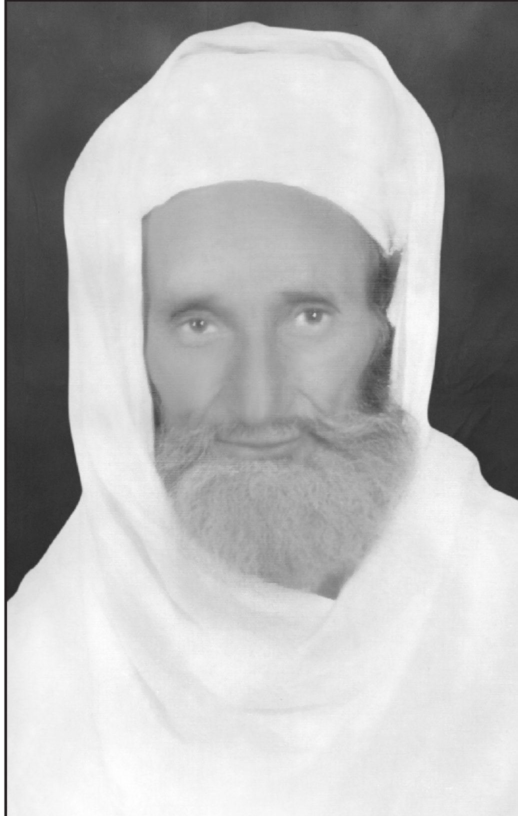
سید مشتاق حُسین بخاری

والدم بزرگوار کی حیثیت ہمارے لیے دوطرح سے ہے۔ وہ ہمارے والد تھے انہوں نے ہماری پرورش کی اور ہماری تعلیم وتربیت کر کے ہمیں اُس مقام پر پہنچایا کہ ہم نے ان کی دوسری حیثیت کو بھی پہچان لیا۔ مکمل پہچان کا تو ہم دعویٰ نہیں کر سکتے مگر اتنا ضرور ہے کہ ہم نے انہیں جلوت وخلوت دونوں میں دیکھا اور دونوں حیثیتوں سے ان کو ایک جیسا پایا۔ ہم نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ عام لوگ یا ان کے عقیدت مند ان کو کچھ اور سمجھتے ہیں اور گھر میں اپنی اولاد اور اپنی ازواج کے سامنے کچھ اور طرح ہوتے ہیں ہم نے انہیں زمینداری کرتے دیکھا، زمینوں کی دیکھ بھال اور گھر کے اندر مختصر تعداد میں جانوروں کی پرورش اور حفاظت کرتے ہوئے دیکھا، گھر میں بیٹھے ہوئے اور لکھتے ہوئے، سوتے ہوئے، بیٹھتے ہوئے دیکھا اور سفر کرتے ہوئے دیکھا۔ لوگوں کا علاج معالجہ کرتے اور انہیں پند ونصائح کرتے ہوئے دیکھا۔

کام کے اوقات میں اور گفتگو کے علاوہ ہم نے ہمیشہ انہیں عبادت کرتے، ادائیگی نفل اور ذکر، اذکار کرتے دیکھا۔

ہمارے والد (پیر سید محمد علی شاہ) کے بارے میں اس کتاب میں آپ اُن کی زندگی کی مختلف جھلکیاں دیکھیں گے۔ ان مضامین میں آپ اُن کی صفات زندگی، معمولات زندگی، حالات زندگی اور چند عقیدت مندوں کو اُن کی ذات بابرکات پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہوئے بھی دیکھیں گے۔

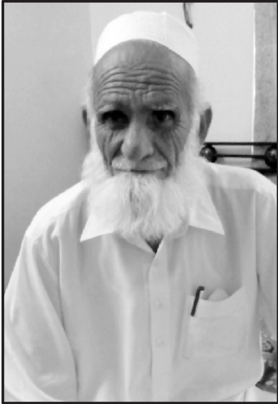
ہم اُن کی اولاد، اُن کے بارے میں بیان کردہ تمام حقائق کے گواہ ہیں ان باتوں میں کوئی غلط بیانی نہیں ہے کوئی مبالغہ نہیں ہے اور جو کچھ بھی بیان ہوا ہے وہ سو فیصد سچ ہے۔



مرحوم پیر صاحب سید محمد علی شاہؒ



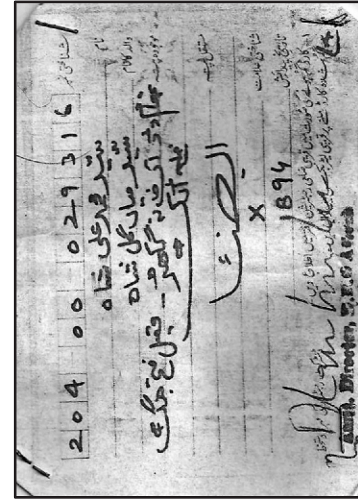
فرزند پیر صاحب فدا حسین شاہ



فرزند پیر صاحب سید حمید شاہ

راقم الحروف ان تمام تحریروں اور اُن کے مندرجات کو جمع کر کے آپ تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ میں عمر میں اپنے دوسرے برادران کی نسبت چھوٹا بلکہ پیر صاحب کی اولاد میں تقریباً وسط میں ہوں اور میں یہ دعویٰ بھی نہیں کرتا کہ میں اُن کے بارے میں دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ جانتا ہوں تاہم اپنے والد مرحوم (پیر سید محمد علی شاہ) کے بارے میں چند معروضی حقائق بیان کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔

میں کوشش کروں گا کہ اس مجموعے میں جو حقائق وواقعات دیگر حضرات نے بیان کر دیئے ہیں اُن کی بلاوجہ اعادہ Repeatition نہ ہونے پائے۔



پیدائش و وفات:

پیر سید محمد علی شاہ مرحوم ان کے اپنے شناختی کارڈ کے مطابق 1894ء کو موضع لنگر میں الحاج سید میاں گل شاہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ اور 18 دسمبر 1985ء بمطابق 5 ربیع الثانی 1406ھ کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

خاندان:

پیر صاحب مرحوم کی زوجیت میں دو خواتین تھیں۔

محترمہ بی بی خانم جان:

پہلی اور بڑی محترمہ بی بی خانم جان، جو رشتے میں آپ کی سگی خالہ کی بیٹی تھیں اور حضرت پیر سباکؒ کے ایک فرزند حاجی رکن الدین کی اولاد سے ایک شاخ حاجی خیل سے تعلق تھا۔ آپ موضع لنگر کے سید محمد عالم شاہ کی بیٹی اور سید محمد اکبر شاہ آف لنگر کی ہمشیرہ تھیں۔ آپ ایک نہایت ہی پرہیزگار، متقی، قناعت پسند اور سادہ مزاج اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ پیر صاحب کی رحلت کے 3 سال بعد 7 مارچ 1988ء کو آپ بھی اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔

محترمہ بی بی مدینہ خانم:

آپ کا تعلق بھی خاندان پیر سباک کی محمد علی خیل شاخ سے تھا۔ والد کا نام پیر سید فضل حسین تھا جن کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی وہ ہمارے ممدوح پیر صاحب سے پانچویں پشت میں مل جاتے ہیں۔ پیر سید فضل حسین بھی اپنے بزرگوں کی طرح ایک درویش صفت بزرگ تھے۔ ان کے اجداد بھی موضع پیر سباک سے لنگر اور پھر لنگر سے موضع گکھڑ آ کر آباد ہوئے۔ گاؤں کے لوگ آپ کی بہت عزت کرتے تھے اور اپنی حاجات کے سلسلے میں آپ کے پاس دعا کے لیے حاضر ہوتے۔ بزرگ کہتے ہیں کہ خشک سالی کے موسم میں آپ سے بارش کے لیے دعا کروائی جاتی یا جاتے جاتے آپ پر اچانک گھڑا بھر پانی پھینک دیا جاتا تو دیکھتے ہی دیکھتے بادل آ جاتے اور پورا گاؤں بارش سے جل تھل ہو جاتا۔

بڑی بی بی (بی بی خانم جان) لنگر میں رہتی تھیں اور بی بی مدینہ خانم شادی کے بعد لنگر گئیں مگر چونکہ ہمارے نانا سید فضل حسین شاہ کی اولاد نرینہ نہ تھی لہٰذا والد اور والدہ کی یکے بعد دیگرے وفات کے بعد آپ واپس گکھڑ آ کر اپنی اکلوتی بہن بی بی سکینہ جان کے ساتھ رہائش پذیر ہو گئیں۔ اور آخری عمر تک گکھڑ میں ہی رہیں۔ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ پیر صاحب بھی عمائدین گکھڑ کی بار بار کی فرمائشوں اور درخواستوں کے بعد موضع گکھڑ منتقل ہو چکے تھے۔ لہٰذا بقیہ زندگی میں آپ پیر صاحب کی صحیح معنوں میں رفیق حیات تھیں۔

بی بی مدینہ خانم بھی ایک نیک، ہمدرد اور غمگسار خاتون تھیں۔ گھر میں آپ پیر صاحب کے مہمانوں کی مہمان نوازی اور اپنے بچوں کی کفالت و پرورش کے علاوہ گاؤں کی غریب اور بے یار و مددگار عورتوں کا ایک مستقل سہارا تھیں۔ چنانچہ آپ کے گھر پر گاؤں کی عورتوں کا ایک جھمگٹا لگا رہتا جو اپنی دنیاوی اور روحانی حاجات کے لیے شام تک آپ کے پاس موجود رہتیں اور آپ ہر ایک کی ضرورت پورا کر کے رہتیں۔ چونکہ آپ سخت پردہ دار خاتون تھیں، گاؤں میں کسی کے ہاں جانا نہیں ہوتا تھا مگر گاؤں کی عورتیں آپ سے بے پناہ پیار کرتی تھیں چنانچہ جب کوئی بوڑھی عورت یا نوجوان خاتون فوت ہو جاتیں تو قبرستان لے جانے سے پہلے اُس خاتون کی میت کو ہمارے گھر کے دالان تک لایا جاتا۔ مرد لوگ میت رکھ کر دور ہو جاتے اور آپ اُس میت کی لواحقین خواتین کے ساتھ میت کا دیدار کر کے اُسے رخصت کرتیں۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں آپ علاج کی غرض سے پشاور میں راقم الحروف کے پاس ٹھہری ہوئیں تھیں۔ گاؤں کے علاوہ آپ اپنے عزیز و اقارب اور رشتہ داروں میں بھی اپنی سخاوت، مہمان نوازی اور ہمدردی کے لیے بے انتہا مقبول تھیں۔ آپ نے اپنے گھر میں درس قرآن کا حلقہ قائم کر رکھا تھا اور پوری زندگی اس کو جاری رکھا۔ اور ہزاروں کی تعداد میں طالبان قرآن آپ سے مستفید ہوئے۔ آپ 2 دسمبر 1981ء بمطابق 4 صفر 1402ھ کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔ آپ کی وفات پر نہ صرف آپ کی اولاد بلکہ آپ کے ہزاروں شاگرد مرد و خواتین بلکہ گاؤں کا بچہ بچہ ماتم کناں تھا۔

(ہمارے بھتیجے عزیزم ڈاکٹر اسد حسین شاہ نے اس کتاب میں اپنے ایک مضمون ''بی بی خانم اور مدینہ خانم''، میں انہی دو خواتین کی زندگیوں کی چند دلچسپ جھلکیاں دکھائی ہیں)۔

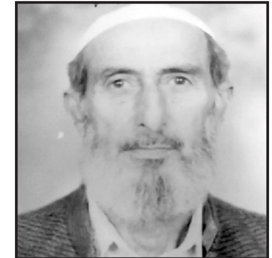
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات — تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی — میں تیری خدمت کے قابل جب ہوا تُو چل بسی

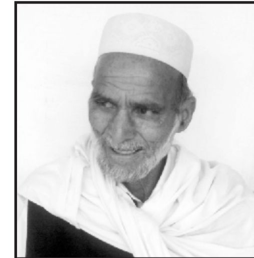
(اقبال)

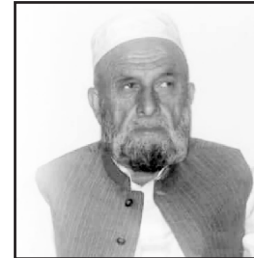
اولاد:

پیر صاحب سید محمد علی شاہؒ کو اللہ تعالیٰ نے اولاد کثیر سے نوازا تھا۔ خیراً کثیراً کے مصداق آپ کے نو بیٹے اور ایک بیٹی آپ کی وفات کے وقت بحیات تھے اور سب کے سب والدین کے فرمانبردار اور اپنے اپنے طور پر خلق خدا کی خدمت کو شعار بنائے ہوئے تھے۔ کچھ اولاد بہت بچپن میں ہی آپ کو داغ مفارقت دے گئی تھی۔

بیٹوں کی ترتیب کچھ یوں تھی۔ سید محمد اکرم شاہ، سید حمید شاہ اور سید عنایت حُسین شاہ (بی بی خانم جان کے بطن سے) سید فدا حُسین شاہ، سید محمد حسین شاہ، سید قربان حسین شاہ، شہناز بی بی، سید مشتاق حسین شاہ، سید علی حیدر شاہ اور سید سجاد حسین شاہ (بی بی مدینہ خانم کے بطن سے)۔


سید محمد حسین شاہ


سید محمد اکرم شاہ


سید علی حیدر شاہ

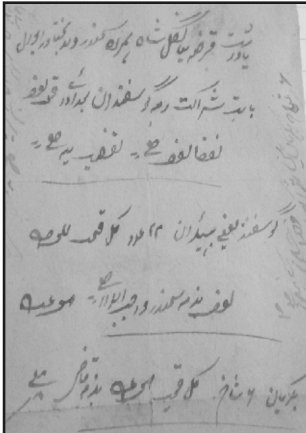
اس وقت سید محمد حسین شاہ متوفی 23 اپریل 2005ء سید محمد اکرم شاہ متوفی 22 دسمبر 2008ء، سید علی حیدر شاہ متوفی 8 ستمبر 2012ء کے علاوہ تمام اولاد بمعہ اکلوتی دختر شہناز بی بی بقید حیات ہیں اور اپنے والدین کی زندگی کے اصولوں کو شعار بنا کر ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کے بیٹے بھی اس وقت صاحب اولاد کثیر ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

شہناز بی بی:

آپ کی اکلوتی دختر نیک اختر محترمہ شہناز بی بی حاجی پیر سیدن گل شاہ مرحوم کے بیٹے ریٹائرڈ کیپٹن سید محمد جُنید شاہ کے عقد میں ہیں اور اپنے نو بھائیوں کی نورِ نظر ہیں۔ اکلوتی ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے والد کی لاڈلی بیٹی تھیں اور ساتھ ہی پیر صاحب مرحوم نے انہیں بہت سے روحانی علاجوں کا اذن عطا کیا ہوا تھا اور بہت سے طبی نسخے آپ کو ہی سکھائے گئے تھے جو آج بھی خلق خدا کے فائدے کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ کتاب مرتب کرتے وقت اُن کی یادداشتوں سے بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔

والد گرامی سید میاں گل شاہ:

پیر صاحب کے والد الحاج حضرت سید میاں گل شاہ پیر سباکؒ کے پوتے بانی بیت الغریب حضرت پیر سید زین الدینؒ کے فرزند گنج علوم پیر سید محمد علی شاہؒ کی شاخ سے تھے اور ان کے بیٹے سید لطف اللہ شاہ کی اولاد سے تھے۔ آپ بھی اپنے دور کے ولی اور بزرگ گزرے ہیں۔ اُن کی بعض تحریریں محفوظ رہ گئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صاحب علم و فضل بھی تھے۔ ہمارے ممدوح پیر سید محمد علی شاہ ان کی اکلوتی اولاد تھے۔ اپنی اکلوتی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے سفر اور جدائی کی صعوبتیں برداشت کیں مگر انہیں انسان کامل بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھا۔ آپ نے اُس دور کی سفری صعوبتوں کے باوجود حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ رزق حلال کے لیے تجارت اور زمینداری کو وسیلہ روزگار بنایا۔ آپ کے ابتدائی بزرگ جو پیر سباک کو چھوڑ کر موضع لنگر ولگھڑ آ گئے تھے مگر پیر سباک میں اُن کا آنا جانا برقرار رہا مگر الحاج میاں گل شاہ پیر سباک میں اپنی آبائی جائیداد کو چھوڑ کر یہیں کے ہو رہے۔ چنانچہ ان کی جائیداد پر اپنے ہی خاندان کے لوگوں نے قبضہ کیے رکھا جسے بعد ازاں ان کے ہونہار بیٹے الحاج پیر سید


سید میاں گل شاہ کی ایک تحریر کا عکس

محمد علی شاہ نے عدالتی کاروائی کے ذریعے واگزار کروایا۔ آپ کے ہاتھ کا تقریباً سو سال پرانا تحریر شدہ نہایت ہی خوبصورت اور مکمل شجرہ نسب (بصورت قلمی نسخہ) آج تک محفوظ ہے اور علم الانساب کے ماہرین اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

ہمارے والد پیر سید محمد علی شاہؒ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کے والد سید میاں گل شاہ بھی اکلوتے تھے۔ ہمارے خاندانی شجرہ کے مطابق چار پشتوں تک وہ ایک ہی تھے۔ حتیٰ کہ پانچویں پشت کے یہ بزرگ تین بھائی سید محمد علی شاہ، سید حسن شاہ اور سید طاہر شاہ تھے۔ جو سید میر عصمت شاہ کے فرزند تھے۔ آپ ان تین بھائیوں میں سے سید محمد علی شاہؒ کی اولاد سے ہیں۔ پیر صاحب کے والد اور ہمارے دادا الحاج میاں گل شاہ 13 مارچ 1917ء بمطابق شعبان 1335ھ کو راہی ملک عدم ہوئے۔

آباؤ اجداد:

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا پیر صاحب کے والد محترم موضع پیر سباک ضلع نوشہرہ سے ہجرت کر کے موضع لنگر ضلع کیمبلپور (اٹک) آئے تھے۔

پیر صاحب سید محمد علی شاہؒ کے خاندان کے جید اکابرین کا تفصیلی ذکر کرنے سے پہلے بہتر سمجھتا ہوں کہ اُن کا خاندانی شجرہ مختصراً درج کر دوں تاکہ قارئین کو اُن اکابرین کی ترتیبِ زمانہ سمجھنے میں مدد مل سکے۔ یہاں پر پیر سید محمد علی شاہ کے والد بزرگوار حاجی الحرمین سید میاں گل شاہ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے (قلمی) شجرے سے نقل شدہ شجرہ جو ہمارے برادر بزرگ سید محمد حسین شاہ مرحوم اور ہمارے برادر نسبتی سید محمد جُنید شاہ نے 31 اگست 1968ء کو مرتب کیا ہے، سے نقل کیا جا رہا ہے۔

الحاج پیر سید محمد علی شاہؒ بن الحاج سید میاں گل شاہؒ بن سید امیرؒ بن محمد علی شاہؒ بن سید میر عصمت شاہؒ بن سید لطف اللہ شاہؒ بن پیر سید محمد علی شاہ: بن گنج علوم بانی بیت الغریب شریف پیر سید زین الدینؒ بن پیر سید فرید الدینؒ بن حضرت سید ناصر الدین محمود شاہ المعروف پیر سباکؒ بن سید ابا بکرؒ بن حضرت شاہ اسماعیلؒ بن حضرت میر سید علیؒ بن سید قلندر کریمؒ بن ولی اللہؒ بن سید سلمان شاہؒ بن سید میر قطب الدینؒ

بن سید علی کبیرؒ بن سید طارضؒ بن سید یعقوب شاہؒ بن سید بہاء الدینؒ ملقب بہ (شاہ قطب عالم) بن سید جلال الدینؒ (ملقب بہ مخدوم جہانیاں جہان گشت) بن سید سلطان احمد کبیرؒ بن سید جلال الدینؒ سرخ بخاری اُچ شریف بن سید علی اولیٰ بن سید جعفرؒ بن سید محمدؒ بن سید محمودؒ بن سید احمدؒ بن سید عبداللہؒ بن سید جعفر ثانیؒ بن امام علی نقیؑ بن امام علی محمد تقیؑ بن امام علی موسیٰ رضاؑ (مشہد شریف) بن امام موسی کاظمؑ بن امام جعفر صادقؑ بن امام محمد باقرؑ بن امام علی زین العابدینؑ بن سید الشہدا امام حسینؑ بن امام برحق حضرت علیؑ ابن ابی طالبؓ۔ خاتون جنت سیدہ فاطمہ الزہراؓ بنت خاتم النبین حضرت محمد رسول ﷺ۔

مجاہد زمان سید میر عصمت شاہؒ اور سید محمد علی شاہؒ دوئم:

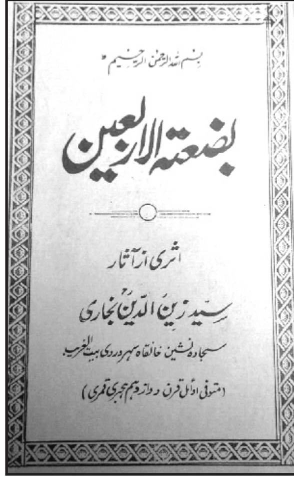
آپ گنج علوم پیر سید محمد علی شاہؒ بانی بیت الغریب کے بیٹے حضرت لطف اللہ شاہؒ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ بھی اپنے بزرگوں کی طرح صاحب علم وفضل اور صاحب احوال بزرگ تھے مگر اُس دور میں جب سکھوں نے اس علاقے پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے یلغار شروع کی تو آپ نے اپنے خاندان اور دیگر مجاہدین کے ہمراہ سکھوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کر دیا۔ چنانچہ سکھوں سے برسرِ پیکار رہتے ہوئے اپنا آبائی علاقہ اور گاؤں پیر سباک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اور اٹک کے پار پنجاب کے نسبتاً زیادہ پرسکون علاقے وادی نلہ (وادی نالہ نندنا) کے گاؤں پہلے موضع لنگر اور پھر دریا پار کر کے موضع گکھڑ آ گئے۔ آپ کے ہمراہ آپ کے بیٹے سید محمد علی شاہ بھی جو جہاد میں ان کے ساتھ شریک تھے ترک سکونت کر کے موضع لنگر و گکھڑ میں آباد ہوئے تاہم پیر سباک گاؤں اور عزیز و اقارب کے ساتھ ان کا تعلق برابر قائم رہا۔ اس علاقے میں پہلے سے آپ کے عقیدت مند اور محبّ موجود تھے لہٰذا دونوں باپ بیٹا اپنے بزرگوں کی طرح رزق حلال کی کمائی کے ساتھ اپنے عقیدت مندوں اور عوام الناس کے لیے رشد و ہدایت کا پیغام پہنچانے پر لگ گئے۔

ہماری ہمشیرہ شہناز بیگم کے مطابق ان دونوں باپ بیٹے کی قبریں موضع گکھڑ میں ہیں جن میں سے پیر سید محمد علی شاہ کی قبر کی نشاندہی آج بھی موجود ہیں۔

گنج علوم پیر سید محمد علی شاہؒ اول:

آپ پیر صاحب کے ہم نام اوران کی ساتویں پشت کے جلیل القدر بزرگ گزرے ہیں۔حضرت پیر سباکؒ کے پوتے پیر سید زین الدینؒ کے فرزند ارجمند تھے۔اپنے وقت کے کامل بزرگ اور ولی تھے۔ اپنے والد پیر سید زین الدینؒ کے سجادہ نشین اورانہی کے سلسلہ کے پیروکار تھے۔آپ کی اولاد کے لوگ مختلف علاقوں میں رہنے کے باوجود اپنے آپ کو پیر سباکیوں کی محمد علی خیل شاخ کہلوانا پسند کرتے ہیں آپ کے ایک بیٹے سید لطف اللہ شاہؒ تھے جن کی اولاد موضع لنگر، گکھڑ، جبی (ضلع اٹک) میں آباد ہے۔ پیر صاحب اور راقم الحروف ان ہی سید لطف اللہ شاہؒ کی اولاد سے ہیں دوسرے بیٹے محمد منیر ہیں جن کی اولاد موضع بیت الغریب ضلع نوشہرہ اور موضع کھوئیاں (تحصیل تلہ گنگ ضلع چکوال) میں آباد ہیں۔ تیسرے بیٹے سید مہر محمد ہیں جن کی اولادِ کثیر ضلع میانوالی میں آباد ہیں اور یہاں سے نقل مکانی کر کے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں راولپنڈی، اسلام آباد، لاہور اور پشاور میں آباد ہیں اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔سید مہر محمد شاہ کی اولاد میں اعظم شاہ، مسعود شاہ (اولاد کثر کی ضلع میانوالی) کے ساتھ ذاتی دشمنی کی وجہ سے موضع تبی سر چلے آئے۔ بعد میں ان کے والد محترم حمید شاہ بھی تبی سر چلے آئے۔ مظفر شاہ حمید شاہ کے پوتے اور اعظم شاہ کے فرزند تھے۔ولی کامل اور عالم تھے۔ان کی لائبریری مشہور ہے۔ان سب کے مزارت تبی سر میں ہیں اعظم شاہ کے بھائی علی اکبر شاہ جنگ پیر سباک میں شہید ہوئے۔سادات تبی سر ضلع میانوالی اسی شاخ سے ہیں۔کیپٹن سید حلیم شاہ اُن کے فرزند سید الطاف حسین شاہ، سید چراغ حسین شاہ، میجر منور شاہ اور کرنل اعظم شاہ وغیرہ اسی خاندان سے ہیں۔ پیر سید محمد علی شاہ اول کے بیٹے سید لطف اللہ شاہ کی اولاد سے ایک بیٹے سید علاء الدین کامل ولی بزرگ گزرے ہیں۔جولا ولد تھے مگران کا مقبرہ خواجہ خیل ضلع لکی مروت میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔چوتھے بیٹے سید محمد غدیر کی اولاد سے سید گلاب شاہ ہیں جو لاولد ہیں۔گنج علوم پیر سید محمد علی شاہ اول کی قبر بھی اپنے والد کے مقبرے کے ساتھ ہی موضع بیت الغریب نوشہرہ میں ہے اور مرجع خلائق ہے۔

امام عصر مقتدائے وقت بحر العلوم پیر سید زین الدینؒ:



آپ فرید عصر پیر سید فرید الدین کے بڑے بیٹے اور پیر ناصر الدین سید محمود شاہ پیر سباک کے پوتے ہیں اپنے والد کی وفات کے بعد مسند ارشاد پر فائز ہوئے اور مریدین اور عوام الناس کی رشد و ہدایت اور راہنمائی کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی۔ ابتدائی تعلیم حضرت مولانا/خوند چالاک (سالاک) کی صحبت میں حاصل کی اور طریقت و معرفت کی منازل مولانا یونس افلاک ساکن تورو کے ساتھ طے کیں اورانہی سے سند تکمیل پائی اور ابتداًا اپنے آبائی سلسلے سہروردیہ میں اپنے والد صاحب سے بیعت تھے۔آگے چل کر معرفت اور سلوک کے اعلیٰ مدارج اپنے پیرومرشد شیخ سعدی لاہوری سے حاصل کیے اورانہی بزرگ یعنی حضرت شیخ سعدی لاہوری کے اشارے پر علم کلام واخلاق پر مشہور کتاب ”بضعتہ الاربعین“ لکھی۔اس کتاب کے قلمی نسخے کو نامور قانون دان اور خاندان پیر سباک کے چشم و چراغ سید محمد ایوب بخاری نے 15 اکتوبر 1991ء کو زیورِ طبع سے آراستہ کروایا۔بعدازاں اس کتاب کی افادیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سید محمد ایوب بخاری نے بڑی محنت سے اس کا اردو ترجمہ کر کے 2000ء میں اسے طبع کروا کر اہل علم و دانش سے خراجِ تحسین وصول کیا۔آپ اپنے وقت کے بڑے مجتہد اور صاحب طریقت و معرفت بزرگ تھے۔دن رات عبادت، ریاضت اور مجاہدے میں مشغول رہتے آخری عمر میں بہت زیادہ عبادت کی وجہ سے طبیعت خلوت اور گوشہ نشینی کی طرف مائل ہوگئی اور پھر اپنے خویش واقارب کی رفاقت ترک کر کے پیر سباک سے روانہ ہوئے اور ایک پہاڑی علاقے کو اپنا مسکن بنایا اور اس کا نام ”بیت الغریب“ یعنی مسافروں کا گھر رکھا۔یہ موضع بعد میں آپ کی برکات سے منور ہوکر آباد ہوا۔چنانچہ آخری دم تک اسی جگہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہے اوراسی جگہ وفات پائی۔

صاحب ''تذکرہ پیر سباک'' عزیزم ڈاکٹر چراغ حسین شاہ کتاب ''مناقب زین الدین'' کے حوالے سے لکھتے ہیں ''عام لوگ ان کو مجتہد وقت سمجھتے تھے بڑے بڑے مجمعے کے سامنے ایک مسئلہ پر یہاں تک بولتے کہ کسی کو انکار کی طاقت نہ رہتی تھی۔ اور آپ کے ہمعصر مخالفین تک نے آپ کے علم ظاہری کی فراوانی کا اعتراف کیا''۔ ''مناقب زین الدین'' نام کی کتاب آپ کی تعریف اور مناقب میں لکھی گئی ہے۔ فارسی میں لکھی گئی اس کتاب کے دو حصے ہیں حصہ نثر فضل حسین عبدالصمدانی اور حصہ نظم (شعری) فضل احمد تخلص ملنگ نے تحریر کی ہے۔ اس کتاب کے کئی نسخے ہمارے خاندان میں موجود ہیں۔ اسی طرح کے قلمی نسخے کی ایک نقل راقم الحروف نے اپنے Colleague مولانا عبدالصمد افغانی مدرس عربی/ فارسی گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 پشاور سے برائے ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ تحریر کروائی تھی۔ کتاب ''بضعتہ الاربعین'' میں سید محمد ایوب بخاری ایڈوکیٹ نے تعارفی کلمات میں لکھا ہے۔

''مولف کتاب سید زین الدین'' در اوائل قرن دوازدہم ہجری قمری در منطقہ پشاور (نوشہرہ) در دہکدہ بیت الغریب / پیران کلی کہ خودش بنا کردہ بودی می زیست۔ مولف بضعتہ الاربعین مذہب حنفی و مسلک سہروردی بودہ است''

اپنے بزرگ سید محمد ایوب بخاری سے میں نے بزرگوں کی روایت کردہ بات سنی تھی کہ حضرت پیر سید زین الدینؒ ابتدا (دور جوانی) میں عبادت و تقویٰ کے ساتھ ساتھ دنیاوی جاہ و حشم کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے اور حاسدوں سے تنگ آ کر آپ اپنے ساتھ چالیس گھڑ سوار رکھتے تھے تاکہ دشمنان، حاسدان آپ کو زک نہ پہنچا سکیں بعد ازاں کثرت عبادت اور زہد کی وجہ سے آپ کی زندگی کے انداز ہی بدل گئے اور ایک مرتبہ بھری مجلس میں جب ایک شخص نے آپ سے ایک دوسرے شخص کی شکایت کی کہ وہ آپ کے بارے میں ایسا ویسا کہتا ہے تو آپ نے فرمایا ''اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے شریعت پر استقامت عطا فرمائی ہے جو لوگ میری غیبت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی عمریں دراز کرے''۔

پیر سید زین الدین موضع بیت الغریب پیران کلی ضلع نوشہرہ میں مغل طرز کی چھت کے بغیر ایک عمارت کے اندر مدفون ہیں۔ پیر سید زین الدینؒ کے گیارہ فرزند تھے۔ پیر سید محمد علی شاہؒ کا ذکر قبل ازیں ہو چکا۔

باقی اولاد میں حاجی عبدالشکور، کرم الدین، اسداللہ، حافظ محمد عمر، شاہ نجم الدین، مسعود شاہ، سعد الدین، عماد الدین، عبدالحق اور قیاس الدین شامل تھے۔ ان میں حاجی عبدالشکو اور حافظ محمد عمر کے بارے میں ''مناقب زین الدین'' کے مصنف لکھتے ہیں یہ صاحب کمال اور ارباب حال تھے۔

پیر سید زین الدین کی ولادت کا اندازہ 1035ھ اور 1040ھ کے درمیان لگایا گیا ہے جبکہ آپ 1119ھ میں اس جہانِ فانی سے روپوش ہوئے۔

اٹک کے ایک صاحب حال اور صاحب علم و دانش نے حضرت پیر سید زین الدینؒ کو مندرجہ ذیل منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

چوں زین الدین سراپا زینِ دین شُد
چراغِ محفل اہلِ یقین شد
زگفتارِ پیمبر گوھری چند
بہم آورد و نامش اربعین شد

نذرؔ صابری

حافظ محمد عمرؒ:

پیر سید زین الدین کے چوتھے بیٹے تھے۔ ان کی اولاد سادات پیر سباک کی حافظ خیل برانچ کہلاتی ہے۔ ان کے بیٹے حاجی میر محمد حسن یا سید محمد حسن عمائدین موضع بُوٹا کی درخواست پر بیت الغریب سے بوٹا ضلع اٹک آ کر آباد ہوئے اور اپنے روحانی کمال اور دیگر اوصاف حمیدہ سے اس گاؤں کو ڈاکوؤں وغیرہ کی دستبرد سے محفوظ کیا اور ساتھ ہی لوگوں کی رشد و ہدایت کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔ پیر سید محمد حسن کے بیٹے حضرت شاہ یحییٰ عالم دین ہونے کے ساتھ درس و تدریس کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ آپ نے پشتو زبان میں ایک کتاب ''منتخب'' کے نام سے عقائد کے بارے میں لکھی آگے چل کر آپ کی اولاد میں سے سادات بوٹا کی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں۔

سکھوں کے دور میں جب پشتونوں کے مختلف قبائل یوسف زئی، خٹک اور مہمند قبائل نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا تو اس وقت سادات پیر سباک کے بزرگوں نے اس جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور سکھوں کے قبضے کے بعد سب سے زیادہ نقصان بھی پیر سباک کے سادات کو اُٹھانا پڑا کیونکہ اس کے بعد ان کی جائیدادیں وغیرہ سکھوں کے قبضے میں چلی گئیں۔

پیر سید فرید الدینؒ:

آپ پیر سباک کے سب سے بڑے بیٹے تھے اپنے والد کی وفات کے بعد 1025ھ ہجری میں منصب ارادت سنبھالا۔ آپ اپنے والد بزرگوار حضرت سید ناصر الدین محمود پیر سباکؒ سے سلسلہ سہروردیہ میں اور حضرت شیخ سید آدم بنوری سے سلسلہ قادریہ، مجددیہ، نقشبندیہ میں اور حضرت شیخ عبدالوہاب اخوند پنجو بابا سے سلسلہ چشتیہ میں، حضرت سید یونس گیلانیؒ سے سلسلہ قادریہ میں بیعت ہوئے۔ شہر صفا آپ نے ہی آباد کیا اور اسے بعد میں موضع پیر سباک کا نام دیا۔ آپ کو اس وقت کے بادشاہ جہانگیر بادشاہ نے خان دوران صوبیدار کابل وقندھار کی وساطت سے ماہ رجب 1025ھ ہجری میں قبالہ عطا کیا۔ ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ نے اپنی کتاب تذکرہ پیر سباک میں آپ کا سن وفات 1059ھ ہجری بمطابق 1649ء متعین کیا ہے۔

آپ کا مزار اقدس نوشہرہ سے راولپنڈی جانے والی سڑک کے کنارے موضع ڈھیری کٹی خیل کے قبرستان میں واقع ہے۔ پیر سید فرید الدینؒ نے ہی پیر سباک علیہ رحمت کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ جو موضع بلند خیل (ٹل) میں دریائے کرم کے کنارے ایک پرفضا مقام پر موجود ہے۔

شیخ عبدالرحیم (میاں جی صاحب)

پیر سباکؒ علیہ رحمت کی مندرجہ بالا اولاد کے علاوہ ایک اور بزرگ شیخ عبدالرحیم المعروف میاں جی صاحبؒ گزرے ہیں۔ شیخ عبدالرحیم بھی حضرت پیر سباکؒ کے فرزند ہیں۔ ان کا مزار ضلع

کوہاٹ کے موضع شویکی میں ہے۔ ان کی اولاد ''میانجی خیل'' کہلاتی ہے۔ مشہور قانون دان پیر سید معصوم شاہ ایڈوکیٹ کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ پیر معصوم شاہ اپنے ایک فرزند سید مکرم شاہ کے ہمراہ 1983ء میں کار کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ جبکہ ان کے دیگر فرزندان مسرت حسین شاہ رمضان 2006ء میں فوت ہو چکے ہیں۔

جبکہ انجینئر پیر سید معظم حسین شاہ بقید حیات ہیں۔ اور پشاور میں رہائش پزیر ہیں۔ اس برانچ کے افراد کی زیادہ تر آبادی مواضعات شہر لکی مروت، شکردرہ، شویکی، شنوا گڈی خیل، ڈم کلہ، ٹولہ بھنگی خیل اور چھپری ضلع میانوالی میں آباد ہیں۔

__☆☆____☆☆____☆☆__

حضرت سید ناصر الدین محمود المعروف پیر سباکؒ

حضرت سید محمود المعروف پیر سباک جن کے نام پر یہ قصبہ آباد ہوا ایک مشہور صوفی بزرگ اور درویش انسان تھے۔ جنہوں نے غالباً مغل بادشاہ جہانگیر کے عہد میں موضع پیر سباک کے ایک پہاڑ کی چوٹی پر برائے چلہ کشی اور عبادت گوشہ نشینی اختیار کی اور پھر وہیں سے آپ کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی اور خلق خدا آپ کی ذات سے فیض یاب ہونے لگی اور اسی دوران میں آپ مَرجع خلائق ہو گئے اور موضع پیر سباک کی بنیاد پڑی۔

حضرت سید محمود المعروف پیر سباک کی زندگی اور حالات کے بارے میں چند کتب طبع ہو چکی ہیں جن میں سے سب سے مشہور کتاب ''تذکرہ پیر سباک''، ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ کی تصنیف ہے اس کے علاوہ بنوں کے ایک مشہور قانون دان سرفراز خان عقاب خٹک کی کتاب ''پیر سباک'' (جو پیر سباک پر پہلی مستند تصنیف کہلاتی ہے)۔

سید محمد ایوب بخاری ایڈوکیٹ اٹک کی کئی تصنیفات اور سید ولی اللہ شاہ کا کتابچہ ''پیر سباک'' بے شمار قارئین کے زیر مطالعہ آ چکی ہیں۔

پیر سباک کی تاریخ وفات کا اندازہ 1023ھ یا 1024ھ لگایا گیا ہے۔

پیر سباکؒ کے والد سید ابا بکرؒ:

یہ اپنے والد شاہ اسماعیل کے بڑے بیٹے تھے اور طریقہ عالیہ سہروردیہ میں اپنے والد سے بیعت تھے۔ آپ کے مُریدوں خلفاء میں حضرت شیخ بہادر خان المعروف ابک بابا، (والد حضرت شیخ رحمکارؒ) ،شیخ نسک دیوانہ اور شیخ حسن افغان ساکن شیدو شامل ہیں۔ آپ کا مزار خوست میں ہے۔



مقبرہ حضرت پیر سباک بمقام ٹل ضلع ہنگو



پیر سباک کے مقبرے کا اندرونی منظر

پیر سباک کے دادا حضرت شاہ اسماعیلؒ:

پیر سباک کے دادا حضرت شاہ اسماعیل حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانی کی اولاد میں سے ایک بزرگ کے مرید اور خلیفہ تھے اور انہی بزرگ کے فیض نظر سے آپ کو پیر، قطب اور غوث کا درجہ ملا۔ انہی بزرگ کے حکم پر خلق خدا کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے آپ خوست آ گئے۔ ابتدا میں کچھ عرصہ ایک غار یا جھونپڑی کو اپنا مسکن بنایا مگر جلد ہی مخلوق خدا آپ کے مقام اور اہمیت سے آگاہ ہو گئی۔ اور مقامی خوگیانی (افغانی) قبائل آپ کو ساتھ لے گئے اور اسی قبیلے کے سردار کی بیٹی کو آپ کی زوجیت میں دیدیا۔ آپ زیادہ عرصہ خوست علاقہ سمت جنوبی وزیرستان میں مجاہدے اور ریاضت میں مصروف رہے۔ دسویں صدی ہجری میں آپ کا وصال ہوا۔ آپ کا مزار مبارک بھی خوست میں ہے۔

حضرت پیر سباک کے بزرگ (والد) سید ابا بکرؒ اور دادا سید اسماعیلؒ افغانستان کے صوبہ خوست کے رہنے والے تھے۔ ان بزرگوں کے بزرگ اُچ شریف (بہاولپور) اور ملتان سے ہجرت کر کے افغانستان میں آباد ہوئے اور وہاں پر اپنے عقیدت مندوں اور عام مسلمانوں کے لیے تبلیغ اسلام اور رشد و ہدایات کا باعث بنے رہے۔ انہی بزرگوں میں سے کچھ آج کی کرم ایجنسی اور وادی تیراہ میں رہائش پزیر رہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت پیر سباک کی وفات کے بعد اُن کی تدفین کرم ایجنسی کے علاقے

بلند خیل (ٹل) میں عمل میں لائی گئی اور اسی جگہ پر آج ان کے فرزند حضرت پیر سید فرید الدین کا تعمیر کردہ مقبرہ موجود ہے۔ پیر سباک، اُن کے خاندان اور اُن کے بزرگوں کے بارے میں تفصیلی بیان کی گنجائش تو اس مضمون میں نہیں ہے تاہم پیر سباکؒ کے بزرگوں کے بارے میں چند حقائق اختصار سے بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ پیر سباکؒ کے بزرگ مدتوں پہلے اُچ شریف اور ملتان سے ہجرت کر کے افغانستان کے صوبے خوست میں آباد ہو گئے تھے اور پھر خوست سے ہی کرم ایجنسی وادی تیراہ اور پیر سباک کے علاقوں کی طرف ہجرت کر کے آباد ہوئے۔ اُچ شریف سادات نقوی البخاری کے جدامجد سید جلال الدین سرخ پوش بخاری کا جائے مسکن ہے۔

سید مخدوم جہانیاں جہاں گشت:

آپ حضرت جلال الدین سُرخ بخاری کے پوتے اور اُن کے سب سے چھوٹے بیٹے سید احمد کبیرؒ کے فرزند تھے۔ آپ کا اصلی نام بھی دادا کی طرح سید جلال الدین تھا 707ھ بمطابق 19 جنوری 1308ء میں پیدا ہوئے۔ آپ بھی اپنے بزرگوں کی طرح علمی اور روحانی صفات سے مالا مال تھے۔ اسلامی تعلیمات کے حصول اور تبلیغ کے لیے دور دراز کے سفر کیے اس لیے آپ جہانیاں جہاں گشت کے لقب سے ملقب ہوئے۔ سید مخدوم جہانیاں جہاں گشت اپنے وقت کی عظیم علمی اور روحانی شخصیت تھے۔ علم وعمل میں کمال کی منزل تک پہنچنے کے بعد اُس وقت کے بادشاہ سلطان محمد تغلق نے آپ کو پورے ہندوستان (برصغیر) کے لیے شیخ الاسلام کے عہدے پر تعینات کر دیا۔ تاریخ میں رقم ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاں جب بادشاہ سے ملنے دارالحکومت دہلی جاتے تو بادشاہ دارالحکومت سے کوسوں پیدل چل کر آپ کے استقبال کے لیے آتا اور دربار میں آپ کو تخت پر اپنے پہلو میں بٹھاتا۔ تاہم آپ نے اپنے اجداد کی روایات کو برقرار رکھا اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد شیخ الاسلام کے اس جلیل القدر عہدے کو ٹھکرا کر علم کے حصول اور اپنے نانا کی امت کو اپنے علمی اور روحانی مرتبے سے فیضیاب کرنے کے لیے دور دراز کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

آپ سات سال کے طویل عرصے تک مکہ میں رہے اور قرآن پاک لکھ کر اپنی روزی کماتے رہے۔ دو سال مدینۃ النبی ﷺ میں رہائش اختیار کی اور اپنے اعلیٰ علمی اور روحانی درجے کی بنا پر مسجد نبوی کی امامت بھی کی۔ 785ھ بمطابق 1384ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں جن میں چند ابھی تک موجود ہیں۔

اُن کے ایک بزرگ سید جعفرؒ 271 ہجری میں فوت ہوئے اور سامرا (عراق/ایران) میں دفن ہوئے۔ ان سید جعفرؒ کے بیٹے سید عبداللہؒ نے سامرا (Samarra) سے ہجرت کی اور ایران کے شہر مشہد میں آباد ہوئے۔ اُن کے پوتے سید محمودؒ مشہد سے ہجرت کر کے بخارا (موجودہ) ازبکستان میں آباد ہوئے۔

سید جعفرؒ جو سامرا میں دفن ہیں۔ گیارہویں امام حضرت علی نقی الہادیؒ کے بیٹے ہیں جو حضرت محمد تقیؒ کے بیٹے وہ حضرت علی رضاؒ کی اولاد، وہ حضرت موسیٰ الکاظم وہ حضرت امام جعفر صادقؒ، وہ امام محمد باقر اور وہ حضرت امام زین العابدین کی اولاد اور وہ سید الشہداء حضرت امام حسین کی اولاد ہیں۔ اور اس طرح حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ سے ہوتا ہوا ہمارے ممدوح پیر سید محمد علی شاہ کا یہ شجرہ نسب خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی ذات والا صفات تک پہنچ جاتا ہے۔ پیر صاحب مرحوم کا یہ شجرہ نسب آپ کے والد پیر سید میاں گل شاہ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے شجرے (قلمی نسخے) کی مدد سے تیار کیا گیا ہے جس کی دیگر کتب کی مدد سے تصدیق بھی ہو چکی ہے اور یہ قلمی شجرہ اور دیگر خاندانی شجرے ہمارے خاندان کے لوگوں کے پاس محفوظ ہیں۔

سید جلال الدین سُرخ پوش بخاری:



سید جلال الدین بخاریؒ

سید جلال الدین سرخ پوش بخاری 595ہجری بمطابق1199ء میں بخارا(موجودہ اُزبکستان) میں پیدا ہوئے۔ سہروردیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ تھے۔ آپ کے بزرگوں میں سے سید محمود مشہد سے ہجرت کر کے بخارا ازبکستان میں آباد ہوئے ۔سرخ رنگ کا چُغہ پہننے پر سرخ پوش مشہور ہوئے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی طرف ہجرت کی اور اُچ شریف کو مرکز رُشد و ہدایت بنایا۔ آپ نے اپنی تبلیغ اور روحانی کرامات سے سیکڑوں ہزاروں لوگوں کو مسلمان کیا۔ جنوبی پنجاب کی چند مشہور اقوام سیال اور چدھڑ وغیرہ آپ کی ہدایت پر ہی دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں بعد ازاں اُچ شریف اور دیگر مقامات پر آپ کی اولاد میں بھی چند مشہور ولی گزرے ہیں جن کے مقابر اور مساجد آج بھی تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ حضرت پیر جلال الدین کا مقبرہ، اُن کی مسجد اور بی بی جِوندہ کا مقبرہ جو شاہ خراسان نے تعمیر کروایا، آج بھی قابل دید ہے اور عالمی ادارے یونیسکو نے انہیں پاکستان کی قدیم ترین اور خوبصورت عمارات قرار دے کر ان کو عالمی ورثہ قرار دیا ہے۔ آپ کی وفات 1291ء اُچ شریف پاکستان میں ہوئی۔



مقبرہ سید جلال الدین بخاری (اوچ شریف)

میں نے اختصار کی غرض سے تمام بزرگوں کے نام درج نہیں کیے تاہم چند ایسے مشہور بزرگوں کے ناموں تک اکتفا کیا ہے جو اپنی بزرگی، ولایت اور عظمت انسانی میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

اب دوبارہ آتے ہیں اپنے اصلی موضوع پیر سید محمد علی شاہ کی ذاتِ بابرکات کی طرف۔

حیات مبارکہ پیر سید محمد علی شاہؒ

حضرت پیر سید محمد علی شاہ خاندان سادات کے چشم و چراغ ہونے کی حیثیت سے بچپن سے ہی نیکی اور پارسائی کی طرف مائل تھے۔ ان کے والد بزرگوار حضرت سید میاں گل شاہ بھی اپنے وقت کے ایک نیک پرہیزگار اور درویش انسان تھے۔ اُس زمانے میں حج کی سعادت حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا اور بہت کم لوگ اس سعادت عظیم سے فیض یاب ہوا کرتے تھے۔ سفر کی صعوبتیں، زادراہ کی کی قلت اور سفر میں مال ومتاع کے لٹ جانے، حتٰی کہ جان کی بازی ہار جانے کے خطرات تک موجود ہوتے تھے۔ مگر حضرت میاں گل شاہ نے اس دور میں یہ سعادت حاصل کر کے اپنے آپ کو اللہ کی اُن چند برگزیدہ ہستیوں میں شامل کروالیا جن کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ٥ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً٥ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ٥ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ٥

ترجمہ: اے نفس مطمئن چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔ (القران سورۃ الفجر)

پیر سید محمد علی شاہ نے بچپن اور جوانی میں جس طرح اپنے والد بزرگوار اور والدہ مرحومہ کی خدمت گزاری کی اُس کی موجودہ دور میں مثال نہیں ملتی۔ ان کی بچپن کے چند واقعات کا ذکر جو آئندہ صفحات میں آئے گا۔ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ طلبِ علم، اطاعت والدین اور تقویٰ و پرہیز گاری میں آج کا یہ بچہ اور لڑکا مستقبل میں یقیناً اپنے آباؤ اجداد کے نقشِ قدم پر چل کر ان کا نام روشن کرے گا۔ حقیقت یہی ہے کہ پیر سید محمد علی شاہ کی زندگی بچپن سے ہی شریعت و طریقت کے احکامات کی پیروکار تھی۔

ابتدائی تعلیم:

آپ کی ابتدائی تعلیم کا اگر چہ کوئی خاص ریکارڈ موجود نہیں ہے لیکن اُن کی مجالس کی باتوں سے یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بہت ہی ابتدائی تعلیم ______ لکھنا پڑھنا، ناظرہ قرآن وغیرہ اپنے والد گرامی سید میاں گل شاہ سے حاصل کی۔ اور اسی دوران اپنے گاؤں لنگر کے قاضی خاندان کے ایک عالم دین قاضی عبدالعلی کے سامنے زانُوئے تلمذ تہہ کیا اور اُس وقت کے مروجہ ابتدائی علوم قرآن، حدیث، فقہ اور ریاضی وغیرہ میں تعلیم حاصل کی۔ قاضی عبدالعلی بعد ازاں راولپنڈی کے قصبہ چوہڑ ہڑپال منتقل ہو گئے۔ اُن کے فرزند مرحوم قاضی افضل کا شمار سلسلہ تبلیغ کے معتبر اکابرین میں ہوتا ہے۔ برادرم سید عنایت حسین شاہ اپنے والد محترم (پیر صاحب) کی زبانی روایت کرتے ہیں کہ اُن کے اُستاد قاضی عبدالعلی مرحوم نے انہیں وصیت کی تھی کہ ان کے وصال کے بعد ان کی میت کو واپس لنگر لا کر کفن و دفن کی ذمہ داری آپ کی ہے چنانچہ آپ نے اپنے استاد کی وصیت کو بعد از وصال پورا کیا اور وہ آج بھی موضع لنگر میں محوِ استراحت ہیں۔

قاضی عبدالعلی مرحوم سے ابتدائی تعلیم کے بعد پہلے آپ ایک قریبی گاؤں موضع بھٹو ضلع اٹک میں اُس وقت کے ایک جید عالم مُلا حبیب کے مدرسے میں داخل ہو گئے۔ پیر صاحب بھٹو میں دوران تعلیم اور وہاں کے اساتذہ کا ذکر اکثر اچھی یادوں کے ساتھ کرتے تھے۔ حضرت مُلا حبیب کے تین بیٹے تھے محمد طیب، غلام فرید اور سلطان محمود۔ محمد طیب اور غلام فرید تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور سلطان محمود بقید حیات ہیں بھٹو میں ہی سکونت پذیر ہیں اور اس وقت ضعیف العمر ہیں۔ ان ہی مُلا حبیب کے نواسے محمد زاہد ہائی سکول باہتر ضلع اٹک میں میرے کلاس اور ڈیسک فیلو تھے جو بعد ازاں جوان عمری میں ہی فوت ہو گئے تھے۔

اس کے بعد پیر صاحب ضلع اٹک کے مشہور قصبے بسال (ضلع اٹک) تشریف لے گئے اور وہاں کی ایک روحانی شخصیت اور جید عالم خواجہ میر احمد کے مدرسے میں داخل ہو گئے اور

حضرت میر احمد بسالویؒ کے بھتیجے اور جانشین خواجہ میاں محمد المعروف ثانی صاحب کے ہاں زانوئے تلمذ تہہ کیا اور تعلیم کے اگلے مدارج کے حصول میں لگ گئے۔ راقم الحروف کی کیمبلپور (اٹک) کالج کے دورانِ تعلیم ایک مرتبہ پیر صاحب سے ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم کا ذکر ہو گیا۔ تو پیر صاحب نے ازراہ تفنن کہا کہ ڈاکٹر مرحوم بچپن میں بہت شرارتی واقع ہوئے تھے میں نے قدرے حیرانی سے پوچھا کہ آپ ان کو بچپن سے کیسے جانتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا تعلق بھی موضع بسال گاؤں سے تھا اور یہ بھی بچپن میں ایک دینی مدرسے کے طالب علم تھے۔ اب راقم الحروف کی یادداشت میں یہ بات یقینی محفوظ نہیں ہے کہ پیر صاحب مرحوم نے ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا ذکر بحیثیت ہم مکتب کیا تھا یا اُسی علاقے کے کسی مدرسے میں ہم عصر طالب علم تھے۔ تاہم ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے بعد ازاں عصری تعلیم کے حصول میں کامیابی حاصل کی وہ ایک متبحر عالم، سکالر اور بے شمار کتب کے مصنف ہیں۔ جن میں ''دو قرآن''، ''دو اسلام'' اور ''من کی دنیا'' مشہور ہیں۔

کتاب ''من کی دنیا'' کا ذکر پیر صاحب کی زبانی یا کسی اور ذریعے سے پیر صاحب کے ایک قریبی معتقد جناب میر باز خان مرحوم تک پہنچا تو انہوں نے اس کے مطالعہ کی خواہش میں برادرم قربان حسین شاہ کے ذریعے مجھ سے کتاب مہیا کرنے کی فرمائش کر دی۔ چنانچہ راقم الحروف نے گورنمنٹ کالج اٹک کی لائبریری سے اپنے نام سے جاری کروا کر مرحوم میر باز خان کو بھجوائی۔ کتاب ''من کی دنیا'' میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے رُوح اور اُس کی حقیقت کو سائنسی اور عقلی دلائل کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

پیر صاحب بسال سے تعلیم مکمل کر کے واپس گھر آ گئے تو کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اُن کے والد مرحوم نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے قدرے سختی سے تاکید کی چنانچہ آپ ایک مرتبہ پھر اپنی کتابیں اور زادراہ لے کر منزل کا تعین کیے بغیر گھر سے روانہ ہو گئے۔ پیر صاحب مرحوم کی زبانی برادرم

سیدعنائت حسین شاہ روایت کرتے ہیں کہ بسال شریف سے واپس آنے کے بعد جب وہ دوسری مرتبہ گھر سے حصول تعلیم کے لیے نکلے تو ضلع ہری پور کی اُس وقت کی ریاست امب (در بند) کے ایک مشہور مدرسے پہنچ گئے۔ آمدورفت اور خط وکتابت کی سہولیات کم ہونے کی وجہ سے عدم رابطہ کی بنا پر والدہ مرحومہ اپنے اکلوتے بیٹے کے فراق میں پریشان ہوگئیں اور اپنی پریشانی کا اظہاراُن کے والدمحترم سے کیا تو انہوں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ”فکر نہ کرو تمھارا بیٹا حصول تعلیم کے راستے میں نکلا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ کامیاب ہوکرہی لوٹے گا“۔

امب میں تعلیم کے حصول کے بعد آپ حضرو (ضلع اٹک) سے ملحقہ ایک گاؤں موضع بھنگی آگئے اور وہاں پراُس وقت کے ایک جید عالم دین حضرت مولانا عبدالحق کے مدرسے میں داخل ہو گئے۔ مولانا عبدالحق (آف حضرو) وہ شخصیت ہیں جنہوں نے مشہور عالم مفسر اور محدث حضرت مولانا عبدالحق حقانی دہلوی (مصنف تفسیرِ حقانی) کی مشکوٰۃ شریف کی شرح کی مشہور کتاب ”اشتعہ اللمحات“ پرحاشیہ بھی لکھا اور اس کا ذکر مختلف دینی کتب میں موجود ہے (تفسیرِ حقانی مکمل چھ جلد اور مولانا عبدالحق حقانی کی کئی مشہور کتب پیر صاحب کی لائبریری میں آج تک موجود ہیں)۔

سلسلہ ارادت:

جس طرح میں نے پہلے ذکر کیا کہ پیر صاحب مرحوم ابتدائی عمر سے ہی تقویٰ تصوف اور روحانیت کی طرف مائل تھے۔ پیر صاحب کے والد مرحوم سید میاں گل شاہ میرا شریف ضلع اٹک کے حضرت خواجہ میر احمد کے مرید تھے۔ میرا شریف کی حاضری کے دوران آپ کو خواب میں ایک بزرگ کی زیارت نصیب ہوئی۔ جو خواب کے دوران لوگوں میں لنگر بانٹ رہے ہیں اور ایک ہجوم آپ سے دعائیں کروا رہا ہے۔ آپ نے وہاں پراس شبیہہ کے بزرگ کو تلاش کیا مگر میرا شریف میں نہ ملا چنانچہ اس بزرگ کی تلاش میں گندگر (ہزارہ) کے پہاڑی علاقے کی ایک خانقاہ باغدرہ شریف پہنچے۔

خانقاہ باغدرہ شریف:

باغدرہ شریف میں آپ کی ملاقات جن بزرگ سے ہوئی ان کی شبیہہ خواب میں دیکھے ہوئے بزرگ سے ملتی تھی۔ چنانچہ آپ کو خواب میں دیئے گئے اشارے کی حقانیت پر یقین آ گیا۔ باغدرہ شریف کے یہ بزرگ حضرت خواجہ عبدالرحیم باغدوریؒ تھے۔ چنانچہ آپ بزرگ کی توجہ کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ کافی دیر بعد جب بزرگ کی توجہ آپ کی طرف ہوئی اور آپ سے پوچھا کہ آپ کو کیا تکلیف ہے تو آپ نے فرمایا کہ حضور دل کی تکلیف ہے، سکون قلب کا خواہشمند ہوں اور ساتھ ہی اپنے تین معصوم بیٹوں کی وفات کا بھی ذکر کیا تو حضرت باغدرویؒ نے ذکر اللہ کا ایک نسخہ تجویز کیا اور فرمایا کہ اسے آزماؤ اور فرق نہ آئے تو دوبارہ آنا۔ آپ نے دیئے گئے نسخے پر عمل کیا اور واپس جا کر بتایا کہ حضور بہت آرام ہے اور پھر اسی لمحے آپ نے حضرت خواجہ عبدالرحیم باغدوریؒ کے دست حق پرست پر بیعت کر لی اور یہاں سے اس خانقاہ کے ساتھ محبت، عقیدت اور عشق کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک برقرار رہا۔

خانقاہ باغدوری سالک آباد شریف:

حضرت خواجہ قادر بخش خانقاہ ہٰذا کے بانی ہیں جن کا شجرہ نسب خاندان مغلیہ سے ملتا ہے۔ آپ اجی صاحب کے نام سے معروف تھے۔ آپؒ کوہ مری کے علاقے مسیاری سے نقل مکانی کر کے باغدرہ شریف میں آباد ہوئے۔ باغدرہ آنے سے پہلے آپ حضرو میں بھی مختصر عرصے تک قیام پزیر رہے اور یہیں سے ہجرت کر کے آپ گندگر پہاڑ کے ایک پر فضا مقام باغدرہ میں رہائش پزیر ہوئے۔ چونکہ آپ روحانی شخصیت ہونے کے علاوہ ایک متبحر عالم دین بھی تھے لہذا مسیاری حضرو میں آپ بہت شہرت حاصل کر چکے تھے اور دور دراز سے طالبان علم علم کی پیاس بجھانے جوق در جوق آپکے پاس آتے۔ انہی طالبانِ علم میں موہڑہ شریف کے حضرت خواجہ محمد قاسم موہڑوی بھی شامل تھے۔ آپ باغدرہ شریف کی خانقاہ نقشبندیہ کے بانی ہیں۔

حضرت خواجہ عبدالرحیم باغدوریؒ:

آپ کی ولادت 1296ھ بمطابق 1876ء میں مسیاری میں ہوئی اور پھر خانقاہ باغدرہ کے سالک آباد ضلع اٹک منتقل ہونے کے بعد آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ سالک آباد میں گزرا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم ضلع اٹک کی اُس وقت کی مشہور درسگاہوں بھوئی گاڑ، حضرو، حسن ابدال سے حاصل کی اور بعد ازاں ہندوستان کا طویل المدت سفر طے کر کے مختلف علماء، مفسرین اور محدثین سے تحصیل علم کیا۔ علم کے حصول کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنے اندر موجود روحانی مقام کو پہچان کر مختلف اولیاء اللہ کے مزارات مثلاً امام ربانی مجدد الف ثانیؒ، حضرت خواجہ شیخ احمد سرہندیؒ پر چلہ کشی کر کے روحانی مراتب حاصل کیے۔ چلہ کشی کے بعد آپ حضرت خواجہ قاسمؒ موہڑوی شریف کے پاس آئے انہوں نے آپ کا شاندار استقبال کر کے انہیں خلافت کے اعزاز سے نوازا۔ حضرت خواجہ قاسمؒ موہڑوی کی آپ پر خاص نظر عنائت ہوئی اور وہ فرماتے کہ باقی تو سب میرے مرید ہیں لیکن قاضی صاحب (خواجہ عبدالرحیم) میری مراد ہیں۔

حضرت خواجہ عبدالرحیم باغدروی کی زندگی قرآن وسنت کے مطابق تھی اور اپنے مریدین کو نصیحت کرتے ہوئے اکثر فرماتے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی زندگی ہمارے لیے ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور یہ کہ ہمیں اسی کا اتباع کرنا چاہیے۔ آپ فرماتے کہ اے لوگو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو غیر اللہ کو دل سے نکال دو۔

آپ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے اُس وقت کے جید اولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور حضرت نظام الدین والی کیئاں شریف نے آپ کے روحانی مرتبے کی تعریف کی۔ آپ کی بے شمار کرامات آپ کے مریدین میں مشہور ہیں۔ آپ نے 31 مارچ 1947ء بمطابق 9 جمادی الاول 1366ھ داعی اجل کو لبیک کہا اور باغدرہ شریف میں اُن کا مسکنِ ابدی خلق خدا کے لیے آج بھی باعثِ رُشد وہدایت موجود ہے۔

پیر صاحب اور خانقاہ سالک آباد شریف:

جب خانقاہ سالک آباد شریف کی تعمیر ہو رہی تھی تو آپ ہر چند روز بعد اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں اور عزیز واقارب کے ہمراہ سالک آباد شریف جاتے اور دربار عالیہ کی تعمیر نہ صرف اپنی نگرانی میں معماروں اور مزدوروں سے کرواتے بلکہ تعمیر کے کاموں میں بذات خود بھی حصہ لیتے اور اپنی ذات یا انانیت کو کبھی بھی اس کام میں آڑے نہ آنے دیا۔ سالک آباد کے لنگر شریف کے انتظام میں بھی آپ کا معتدبہ حصہ ہوتا اس سلسلے میں عرس مبارک کے موقع پر خواجہ عبدالرحیمؒ اور خواجہ محمد اعظمؒ کے خطوط وہدایات بسلسلہ عرس اور لنگر شریف آپ کو پہنچ جاتے اور آپ تن من دھن کے ساتھ ان ضروریات کے مہیا کرنے پر لگ جاتے۔ پیر صاحب خود بھی ولی تھے اور اُن پر اپنے مرشد کی عنایت خاص کی وجہ سے اپنے مریدین کا ایک وسیع حلقہ تھا اس لیے آپ عرس کے مبارک موقع پر باقاعدہ اہتمام کے ساتھ اپنے کثیر تعداد مریدین کے ہمراہ حاضری دیتے اور اس طرح اپنے مرشد خاص سے ہدایت اور درجات کی بلندی پاتے۔

پیر سید محمد علی شاہؒ کی اپنے مرشد سے محبت کی بے شمار مثالیں ہیں زندگی کا کوئی لمحہ اپنے مرشد سے ملاقات کے لیے ضائع نہ ہونے دیتے۔ سالک آباد جیسے اُن کا دوسرا گھر تھا۔ حضرت خواجہ باغدرویؒ کی حیات میں اکثر پیدل سفر کر کے سالک آباد شریف پہنچتے اور مرشد بھی اپنے مرید خاص کو اُسی محبت اور عنایت خاص سے نوازتے۔ پیر صاحب مرحوم خود اس بات کا اکثر ذکر فرماتے کہ حضرت باغدرویؒ جب آخری عمر میں بیمار ہوئے تو وہ پشاور کی لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ پیر صاحب مرحوم کئی دنوں تک اُن کے ساتھ ہسپتال میں اُن کی عیادت کے لیے ساتھ رہے۔

قدرت کا قانون اٹل ہے۔ اجل لا دوا ہے ہسپتال میں مرشد کے وصال کا وقت قریب آ پہنچا تو پیر صاحب نے اپنے مرشد کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ مرشد نے اپنے مرید خاص کے چہرے پر آخری نظر ڈالی۔ اس نگاہِ آخر میں محبت، شفقت اور دعائیں ہی دعائیں تھیں۔ مرشد کے لب کلمہ طیبہ کے لیے حرکت کر رہے تھے اور مُرید خاص کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ صاحبزادہ صاحب اور چند اور

مُرید ساتھ کھڑے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ مرشدؒ اور مریدؒ کے عشق کا سفر تمام ہوتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں

عشق کے خورشید سے شام اجل شرمندہ ہے	عشق سوز زندگی ہے، تاابد پائندہ ہے
رخصت محبوب سے مقصد فنا ہوتا اگر	جوش الفت بھی دل عاشق سے کر جاتا سفر
عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں	رُوح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں
ہے بقائے عشق سے پید ابقا محبوب کی	زندگانی ہے عدم نا آشنا محبوب کی

حضرت خواجہ محمد اعظمؒ نقشبندی:



حضرت خواجہ محمد اعظم باغدوری باغدرہ شریف میں 1920ء بمطابق 1338ھ میں حضرت خواجہ عبدالرحیم کے گھر میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت پر حضرت خواجہ عبدالرحیم انتہائی مسرور تھے کہ انہیں خانقاہ مجددیہ نقشبندیہ کا وارث اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ آپ بھی اپنے والد کی طرح پیدائشی ولی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بچپن سے ہی آپ کی عادات دوسرے بچوں سے مختلف تھیں۔ آپ کی ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد کی زیرنگرانی ہوئی اور اپنے والدؒ کے سلسلے سے ہی آپ کو رشد وہدایت ملی اور انہی کے دست حق پرست سے آپ خانقاہ کے والی اور وارث مقرر ہوئے۔ اور اسی خصوصی تربیت کی وجہ سے روحانیت کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے۔ آپ اپنے مرشد اور والد کی زندگی میں ہی اُنکی خصوصی توجہ اور ہدایت کی وجہ سے اعلیٰ مقام پر فائز ہو چکے تھے۔

31 مارچ 1947ء کے دن جب آپ کے والد اور مرشد حقیقی اس دنیا سے رخصت ہوئے تو آپ چونکہ کم عمر تھے اس لیے آپ کے چچا حضرت خواجہ محمد معصوم المعروف پیر مسکین صاحب اُن کے

گدی نشین مقرر ہوئے مگر 1958ء میں جب یہ بزرگ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو حضرت خواجہ محمد اعظمؒ مسند رشد وہدایت پر متمکن ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنے روحانی فیوض دور دور تک پہنچا دیئے۔ آپ نے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد دور دراز اندرون ملک اور بیرونی ملک کے دورے کیے اور امت مسلمہ میں اتفاق واتحاد کا جذبہ بیدار کیا اور تیزی سے پھیلتی ہوئی الحاد وگمراہیوں سے لوگوں کو خبردار کیا۔ آپ ایک سچے عاشق رسول ﷺ تھے اور اپنے پندونصائح میں حضور ﷺ کی محبت سے سرشاری کا درس دیتے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے وعظ اور پندونصائح میں اپنے بزرگوں کی طرح طریقت و شریعت کی پابندی کو لازم قرار دیتے۔

خواجہ محمد اعظمؒ اور پیر سید محمد علی شاہؒ:

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ پیر صاحب حضرت خواجہ باغدوریؒ کے اولین عُشاق میں سے تھے۔ باغدرہ شریف سے جو تعلق بیعتِ عقیدت شروع ہوا وہ سالک آباد شریف میں اور بڑھ گیا۔ پیر محمد اعظم صاحب پیر صاحب مرحوم کے ہم عصر تھے اور اپنے والد بزرگوار اور پیر صاحب کے قریبی تعلق کے گواہ تھے۔ پیر صاحب فرماتے تھے کہ لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں جب ولی زماں خواجہ خواجگان کا وصال کا وقت قریب آیا تو اُن کا سر پیر صاحب کی گود میں تھا۔ پیر محمد اعظمؒ ان لمحات کے چشم دید گواہ تھے۔ پیر صاحب زاروقطار رو رہے تھے اور جگر گوشۂ مرشد جو خود اپنے والد اور اپنے مرشد کی جدائی کے غم میں نڈھال تھے پیر صاحب کو دلاسہ دے رہے تھے۔ اُن کو بہت دھیمے لہجے اور مختصر الفاظ میں زندگی موت کا فلسفہ بتارہے تھے۔ صبر کا پہاڑ بن کر کھڑے تھے اور اپنے پیر بھائی کو صبر کی تلقین کررہے تھے۔

راقم الحروف کو یاد ہے کہ پیر محمد اعظمؒ ہمارے گاؤں بلکہ ہمارے گھر بھی آتے تھے میں اُس وقت عمر میں بہت کم سِن تھا مگر ہمارے گھر کی بیٹھک میں اُن کا ورود اور اُن کی شکل آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ خواجہ محمد اعظم اور پیر صاحب کی باقاعدہ خط وکتابت ہوتی تقریبات عرس میں آپ کا

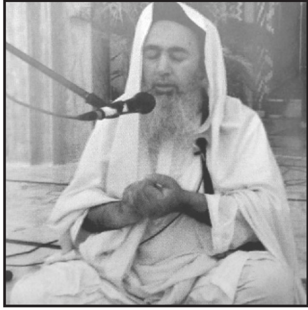
مشورہ اور مدد با قاعدہ شامل ہوتی۔ اِسی طرح جب پیر صاحب عرس کے موقع پر یا دیگر مواقع پر سالک آباد جاتے تو پیر محمد اعظمؒ مسجد میں انہیں محراب کے اندر اپنے ساتھ بٹھاتے۔ خواجہ صاحب فرماتے تھے کہ پیر سید محمد علی شاہ (جنہیں وہ شاہ صاحب کہہ کر پکارتے تھے) کا تعلق خاندان سادات سے ہے، وہ ایک عالم دین ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ میرے والد، میرے مرشد کے خلیفہ خاص ہیں۔ وہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ کس طرح خواجہ عبدالرحیم باغدوریؒ نے آپ کو شمس الخلفاء کا خطاب دیا تھا اور ہمارے دل میں بھی اُن کے لیے وہی قدر اور احترام ہے۔ اور خود پیر صاحب نے بھی خواجہ عبدالرحیمؒ کی وفات کے بعد بھی آپ کے ساتھ تعلقات، احترام اور محبت و عقیدت میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ پیر صاحب کی اپنے مرشد اور اُن کے جانشین کے بارے میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ بقول اقبال

تیری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی — مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی — بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا

اقبال

__☆☆____☆☆____☆☆__

حضرت خواجہ پیر محمد طارق اعظم المعروف ثانی سرکار اور پیر صاحب سید محمد علی شاہؒ



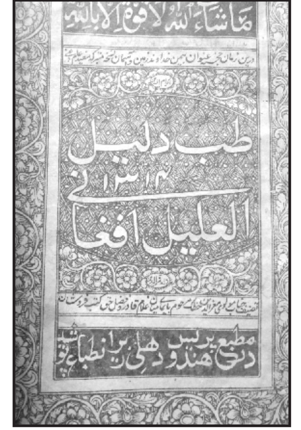
قبلہ ثانی سرکار کے والد اور دادا حضرت قبلہ زمانی خواجہ عبدالرحیمؒ کے ساتھ پیر صاحب کے تعلق کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے۔ حضرت ثانی سرکار کی پیدائش 1958ء میں ہوئی اُس وقت آپ کے دادا حضرت اس دنیا سے جسمانی طور پر اوجھل ہو چکے تھے اور اسی سال آپ کے والد سلطنت رحیمیہ کے تخت پر بحیثیت جانشین کے جلوہ افروز ہوئے اور اسی وقت سے پیر صاحب اور اُن کے مرشد کے درمیان تعلقات کے ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور اسی وقت سے قبلہ پیر صاحب اور خاندان رحیمیہ کے ایک نومولود کے درمیان بھی ایک رابطہ قائم ہو چکا تھا۔ خواجہ محمد اعظمؒ کے گھر اُن کے فرزند/جانشین وارد ہو چکے تھے۔ تو پیر صاحب اللہ تعالیٰ کی فرستادہ اس شخصیت سے کیسے بے خبر رہ سکتے تھے۔ پھر اس روحانی چمن کا یہ نونہال بڑھتے بڑھتے جب ایک تناور درخت بن گیا تو یہ تعلق اور بھی مضبوط ہو گیا۔ اسے اتفاق کہیے کہ پیر سید محمد علی شاہؒ اور پیر محمد اعظمؒ کا وصال یکے بعد دیگرے دسمبر 1985ء اور دسمبر 1986ء میں ہوا۔ پیر صاحب (ہمارے والد) مرحوم کی پہلی برسی کی تقریب میں شمولیت کی دعوت دینے جب ہمارے ایک برادر سید عنایت حسین شاہ سالک آباد شریف پہنچے تو وہاں پر اُسی روز پیر محمد اعظمؒ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ تو برادرم نے نہ صرف جنازہ میں شرکت کر کے ہماری نمائندگی کا فریضہ انجام دیا بلکہ اُسی دن واپس آ کر تحصیل فتح جنگ کے مختلف دیہات میں خواجہ محمد اعظمؒ کی وفات کا اعلان بھی کروایا اور اگلے روز اُنکے جنازہ میں بہ نفسِ نفیس شرکت کی۔ محمد طارق اعظمؒ ثانی سرکار نے اپنے والد کی وفات کے بعد اُن کے پہلے عرس کے موقع پر جب حضرت پیر موہڑا شریف کے دست مبارک سے خرقہ خلافت پہنا تو اُس تقریب میں بھی ہمارے برادر موجود تھے۔ چنانچہ یہ روحانی تعلق جو خواجہ بزرگ حضرت باغدوری اور پیر سید محمد علی شاہؒ کے درمیان شروع ہوا تھا وہ آگے بڑھتے ہوئے دوسری بلکہ تیسری نسل میں بھی برقرار ہے۔

قبلہ پیر ثانی سرکار اکثر ہمارے گاؤں کا دورہ فرما کر نہ صرف اپنے مریدان باصفا کو شرفِ عزت بخشتے ہیں بلکہ مرحوم پیر صاحب کے روضے پر بھی حاضری دے کر اپنے بزرگوں کی رُوحوں کے لیے سکون واطمینان کا باعث بنتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہمارے چھوٹے بھائی الحاج پیر سید علی حیدر شاہ کی وفات پر جناب ثانی سرکار بہ نفس نفیس تشریف لائے اور جنازے کی امامت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ اس موقع پر آپ نے خطاب بھی کیا اور لوگوں کو اپنی رُشد وہدایت سے نوازا اور ساتھ ہی پیر محمد علی شاہ مرحوم کے لیے حضرت باغدوریؒ کے دیئے ہوئے خاص خطاب ''شمس الخلفاء'' کی یاد دہانی بھی کروائی۔ برادرم سید عنایت حسین شاہ والد مرحوم سے روایت کرتے ہیں کہ خواجہ محمد اعظمؒ کے زمانے میں عرس مبارک کی تقریبات میں انتظامیہ کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے ایک ہجوم کو ڈسپلن میں رکھنے کے لیے ثانی سرکار کبھی کبھار سختی بھی کر لیا کرتے تھے۔ کسی نے اس موقع پر صاحبزادہ صاحب کی طبیعت میں سختی کی شکایت کی تو قبلہ محمد اعظمؒ نے فرمایا کہ فکر نہ کریں یہ مکھن سے بھی زیادہ نرم ہو جائیں گے۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے بزرگوں کی تمام خوبیاں اور صفات خصوصاً عاجزی اور ملنساری آپ کے مزاج میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ایسی ہی شخصیت کے لیے علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

سفینہ برگ گل بنالے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہو گا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا
میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شررفشاں ہو گی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہو گا

ذخیرہ کتب / مطالعہ کتب

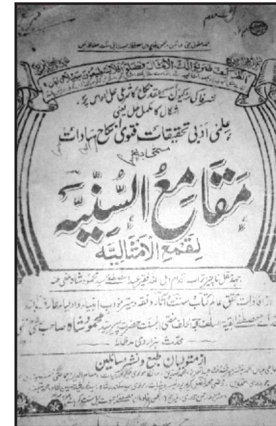
پیر صاحب سید محمد علی شاہ کی ابتدائی تعلیم اور تربیت کا ذکر تو پہلے ہو چکا۔ اس باب میں اُن کی علمیت، شوق مطالعہ، کتب بینی اور ذخیرہ کتب کا تذکرہ ہو گا۔ گزشتہ ابواب میں ذکر ہو چکا ہے کہ پیر صاحب مرحوم کے والد الحاج پیر سید میاں گل شاہ نے جو 13 مارچ 1917ء کو فوت ہوئے، اپنے دور کی تمام تکالیف اور بے سروسامانی کے باوجود حج مبارک کی سعادت حاصل کی تھی، اس لحاظ سے یہ بات خلاف حقیقت نہیں کہ وہ اپنے خاندان، اپنے علاقے اور اپنے دور کے محدودے چند خوش نصیب افراد میں شامل تھے جنہوں نے اُس دور میں حج مبارک کی سعادت حاصل کی۔ ہمارے پاس اپنے دادا کی کوئی کتاب، علمی نسخہ یا ایسی دستاویز تو موجود نہیں ہے جس سے ہم اُن کی علمی حیثیت کا اندازہ لگا سکیں تاہم اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قلمی شجرہ نسب آج بھی ہمارے خاندان کے پاس موجود ہے جس کے انداز تحریر اور تحریر کی خوشخطی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا شمار بلاشبہ اپنے وقت کے پڑھے لکھے اور علمی شخصیات میں ہوتا ہو گا۔ مزید یہ کہ پیر صاحب (ہمارے والد مرحوم) کے لیے برائے حصول علم آپ کا اصرار اور دباؤ بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آپ خود بھی ایک صاحب علم اور صاحب کشف واسرار شخصیت تھے لیکن ترکِ دنیا کی روایت ہمارے خاندان اور بزرگوں میں بھی نہیں تھی اس لیے آپ نے بھی کاروبار دنیا میں رہتے ہوئے اپنے علم اور روحانی مدارج میں بیک وقت اضافہ کیا۔



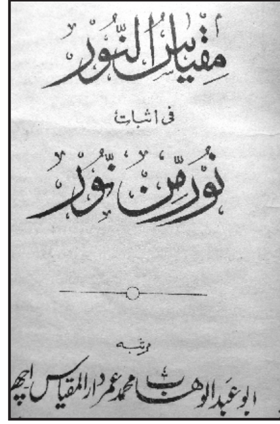
پیر محمد علی شاہؒ کے علمی رتبے، تحصیل علم، اکتساب علم اور اشاعت علم کا ذکر ہو تو اُس میں سب سے زیادہ اثر ان کے والد مرحوم کا ہی نظر آتا ہے جن سے آپ نے ابتدائی تعلیم اور رُوحانی مدراج کے حصول میں ہدایت حاصل کی۔ بعد ازاں حصول علم کے لیے اُن کے طویل سفر، مسافری اور جید اساتذہ سے راہنمائی بھی اُن کے علم کی وسعت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ پیر صاحب کی علم کی وسعت اور اس کی اشاعت میں ان کے کردار پر کوئی دوسری رائے نہیں مگر ایک بات واضح ہے کہ انہوں نے اپنے علم کو کبھی ذاتی مفاد، حصول زر یا پیشہ ورانہ مقاصد کے لیے کبھی بھی استعمال نہیں کیا۔

کچھ ذخیرۂ کتب کے بارے میں

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، پیر صاحب مرحوم کو عبادات اور وظائف و اذکار کے بعد کتب بینی کا از حد شوق تھا۔ وہ ہر روز مطالعہ کتب کو کچھ نہ کچھ وقت ضرور دیتے۔ زیادہ تر دینی کتب، جرائد اور رسائل کا مطالعہ کرتے۔ روزمرہ اخبارات اور کبھی کبھی ادبی (کلاسک) کتب بھی اُن کے زیر مطالعہ رہتیں۔ مرحوم کے اسی شوق اور جستجوئے تلاشِ علم کے طفیل ان کے پاس کتابوں اور رسائل و جرائد کا ایک وسیع ذخیرہ جمع ہو گیا۔ یہ ذخیرہ پیر صاحب مرحوم نے گھر میں دوالماریوں میں محفوظ کر رکھا تھا۔ اس ذخیرے میں اُن کے والد مرحوم حاجی الحرمین سید میاں گل شاہ کی طرف سے وراثت میں ملی ہوئی کتب بھی ہوں گی لیکن کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا کہ ہم ایسی کتابوں کی تخصیص کر سکتے۔



کتابوں کا یہ ذخیرہ ان کی وفات کے بعد ایک مدت تک انہی الماریوں کی زینت بنا رہا۔ اس دوران کچھ کتابیں یقیناً کم بھی ہوئیں تاہم کتاب ہٰذا کی تالیف کے دوران جب میں نے ان کی مکمل فہرست بنانے کی خواہش ظاہر کی تو ہمارے بھتیجے سید شبیہہ

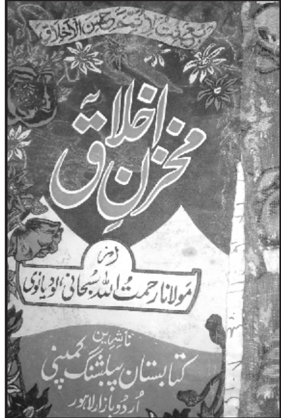


الحسنین بخاری خلف الرشید برادرم الحاج سید علی حیدر شاہ، نے مجھے مشورہ دیا کہ چونکہ اس فہرست کی تیاری میں وقت درکار ہو گا۔ لہٰذا آپ ان تمام کتب کو اپنے ساتھ لے جائیں اور سکون سے اس کی فہرست اور دیگر تفصیلات تیار کریں۔ چنانچہ عزیز کے مشورے سے میں یہ کتب اپنے ساتھ پشاور لے آیا اور آج ان کے بارے میں یہ فہرست تیار کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہو سکا۔ میں عزیزم سید شبیہہ الحسنین کا مشکور ہوں کہ انہوں نے اس بیش قیمت ذخیرے کو محفوظ کرنے کے لیے فراخ دلی سے مجھے پیش کش کی۔ ضروری ہے کہ اس ذخیرہ کتب کے بارے میں چند دلچسپ حقائق بیان کروں۔



☆ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس میں 90 فیصد کتب قدیم ترین نسخہ جات ہیں۔ فہرست میں درج سن طباعت سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

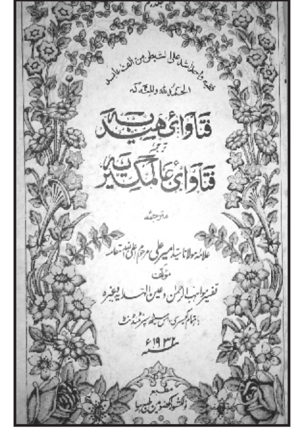
☆ بیشتر کتب بڑے (جہازی سائز) کی ہیں یہ سائز آجکل کے قرآنی سائز کے برابر ہیں۔ شاید اُس زمانے میں کتب چھاپنے کا یہی معیار ہو۔



☆ بیشتر کتب مجلد ہیں اور جلد کے علاوہ کپڑے کے غلاف میں ملفوف ہیں۔ (بچپن میں والد مرحوم کا کتب کی جلد بندی کرنا مجھے یاد ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جلد بندی کا ہنر بھی پیر صاحب نے سیکھا ہوا تھا اور وہ اپنی کتب کی جلد بندی خود کرتے تھے۔

☆ ان کتب میں چند قدیم اور قلمی نسخے بھی ہیں۔ قلمی نسخوں میں

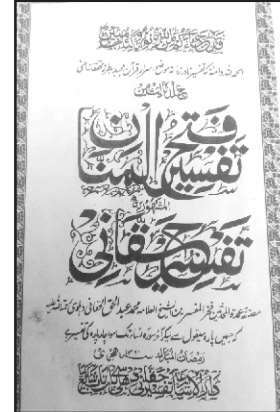
ہمارے دادا جان الحاج سید میاں گل شاہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خاندانی شجرہ آجکل موجود ہے جو آپ نے اپنے ہاتھ سے ایک خاندانی عزیز کو برائے مطالعہ دیا تھا اسی طرح چند اور قلمی نسخے اور کتبِ قدیم بھی مرورِ زمانہ سے ذخیرہ کتب سے غائب ہیں۔ تاہم اب بقیہ ذخیرہ انشاء اللہ آنے والے وقت میں قائم ودائم رہے گا۔



☆ راقم الحروف نے فہرست تیار کرنے میں محنت سے کام لیا ہے تاہم چند کتب کے مصنفین، سن اشاعت اور مطبع وغیرہ کے بارے میں کتاب میں ذکر نہ ہونے کی وجہ سے ان کا اندراج نہ ہوسکا۔ وجہ یہ ہے کہ

0 بعض کتب بہت قدیم ہونے کی وجہ سے بوسیدہ ہو چکی ہیں اوران کے پہلے یا ابتدائی صفحات ناپید ہو چکے ہیں۔ جن پر مصنف کا نام اور دیگر تفصیلات کے اندراج کا امکان ہوسکتا تھا۔

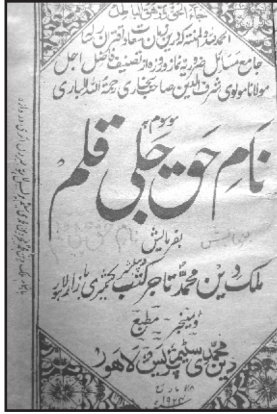
0 بعض کتب خصوصاً عربی کتب بہت قدیم ہیں یہ شاید اُس زمانے کا دستور تھا کہ مصنف کا نام ابتدائی صفحہ پر جلی حروف سے نہیں لکھا جاتا تھا بلکہ کتاب شائع کرنے والے یا چھاپنے والے مطبع کا نام لکھ دیا جاتا تھا اور مصنف کہیں اندرونی صفحات میں اپنا نام تعارفی کلمات وغیرہ میں درج کر دیتا تھا۔ جس کو تلاش کرنے میں بہت دقت پیش آتی ہے۔ اسی طرح بعض



عربی کتبِ قدیم میں سن طباعت ہندسوں کی بجائے حروف میں درج کیا گیا ہے جس کو پڑھنا اور سمجھنا راقم الحروف کی کم علمی اور عربی زبان کی عدم فہمی پر دلالت کرتی ہے۔

0 کتابوں کی بعض جلدوں میں ایک جلد میں کئی کئی کتابیں ہیں جن میں سے بعض فہرست میں درج ہونے سے رہ گئی ہیں۔

(اللہ ہمیں معاف کرے ہم مسلمانوں کی پہلی نسل نے اپنی ابتدائی زبان عربی کو چھوڑا اور برصغیر میں فارسی کو اختیار کیا تو عربی



زبان کے علمی و ادبی ذخیروں سے محروم ہو گئے۔ پھر فارسی کی بجائے اُردو کو اختیار کیا تو فارسی کے وسیع علمی و ادبی ذخیروں سے محروم ہو گئے اور ہماری موجودہ نسل فارسی سے مکمل طور پر لاعلم ہو چکی ہے اور آج ایک مرتبہ پھر ہم اُردو کو چھوڑ کر انگریزی کو اختیار کرنے پر لگے ہوئے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ ہماری آئندہ نسل ایک مرتبہ پھر ہماری طرح اُردو کے عظیم علمی، ادبی اور تاریخی ذخیرہ سے محروم ہو جانے کے حادثہ سے دوچار ہونے والی ہے۔ یہ صدیوں نہیں عشروں کی بات ہے۔ ہمارے قومی رویے سوچ کے دھارے اگر یہی رہے تو پھر بقول شاعر

یہ حادثہ تو میری جاں، کبھی تو ہونا تھا

جس طرح آج ہم اپنے عربی اور فارسی ذخیرہ کتب کی پہچان اور مطالعہ سے قاصر ہیں اسی طرح ہماری اگلی اور دوسری نسل نہ صرف اُردو پڑھنے سے قاصر ہو جائے گی بلکہ وہ اپنے باپ دادا کے بارے میں صرف سرسری معلومات تک محدود ہو جائے گی)۔

☆ بہت ساری کتب پر کتاب کے بارے میں پیر صاحب کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے مثلاً کہاں سے خریدی، کب خریدی اور موضوع کے بارے میں مختصراً نوٹس ملتے ہیں۔

☆ موجودہ ذخیرہ کتب میں بہت ساری کتب ناپید ہیں جو ہماری (ورثاء) کی نااہلی اور عدم دلچسپی پر دلالت کرتی ہیں۔

☆ پیر صاحب کی ایک دو بیاض اور سفرنامہ بھی قلمی نسخے کی صورت میں اس ذخیرے میں موجود ہیں۔ جن سے راقم الحروف کو کتاب کی تالیف کے وقت بہت سے حقائق جاننے میں مدد ملی۔

کتب بہرحال علم کا ذخیرہ اور قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ اگر ہزاروں سال قبل از تاریخ میں پتھر پر لکھی گئی تحریریں آج بھی پڑھی جاسکتی ہیں تو زندہ زبانوں کو کیوں نہیں پڑھا جاسکتا۔ تاہم مجھے اُمید ہے کہ ہماری آئندہ آنے والی نسلیں بھی اس علمی خزانے سے ضرور مستفید ہوں گی۔ انشاء اللہ

فہرست کتب لائبریری پیر سید محمد علی شاہؒ

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سال اشاعت / مطبع	موضوع / زبان
7-1	تفسیر فتح المنان المشہور بہ تفسیر حقانی جلد اول تا ہفتم	عبدالحق حقانی دہلوی	رمضان 1357ھ تا 1360ھ	تفسیر قرآن
10-8	کنز الدقائق جلد اول، دوم، سوم		1357ھ 1938ء	تفسیر و مسائل فقہ ترجمہ فارسی، افغانی
11	اشعۃ اللمعات (ترجمہ فارسی مشکوٰۃ شریف)	عبدالحق بن سیف الدین دہلوی متوطن بخاری	قدیم نسخہ، سن نامعلوم	بزبان فارسی
12	گلستان مترجم	شیخ مصلح الدین سعدیؒ	مطبع منشی نولکشور دہلی	اُردو ترجمہ
13	صلوٰۃ مسعودی	شیخ مسعود ابن محمود بن یوسف سمر قندے	1319ھ مطبع محمدی بمبئی۔ قدیم نسخہ	عبادات شریعہ، فارسی
14	تحقیق مسح الجوربین	مولوی مشتاق احمد	محمود پریس مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن	عربی، اُردو، فارسی
16-15	تفسیر حسینی موسوم بہ تفسیر قادری جلد اول و دوم	ترجمہ مولوی فخر الدین صاحب	مطبع منشی نولکشور دہلی۔ سن طباعت نامعلوم طبع قدیم	ترجمہ اُردو تفسیر قادری
17	مشکوٰۃ المصابیح	ابو محمد الحسین بن مسعود	1271ھ	احادیث زبان عربی
18	کنز فارسی	نصیر الدین بن محمد جمال الاوزدی	مطبع منشی نولکشور دہلی	دینی مسائل، فارسی
19	صحیفہ علویہ	مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	مجموعہ ادعیہ / عربی، اُردو
20	فضائل صدقات	مولانا محمد ذکریا صاحب	مظاہر العلوم سہانپور۔ قدیم طباعت	مسائل صدقات اُردو
21	دستور الصبیان	مولوی محمد خطاب ساکن موضع گاڑہ	مطبع منشی نولکشور دہلی 1324ھ برائے چھجو سنگھ قصہ خوانی پشاور	مسائل زبان فارسی
22	زنجانی محشی	محمد عبدالاحد	محرم 1324ھ	فارسی
23	قوانین زرادے	مصنف نامعلوم	1326ء مطبع منشی نولکشور دہلی، برائے چھجو سنگھ قصہ خوانی پشاور	عربی، فارسی
24	شریعت و طریقت	محمد عظیم صاحب گکھڑ ضلع گوجرانوالہ	عصر جدید پریس میرٹھ	اُردو
25	سیف چشتیائی / حجۃ اللہ البالغہ	حضرت سید مہر علی شاہ	مطبع المصطفائی لاہور	اُردو
26	یوسف زلیخا	محمد عبدالمجید	1331ء مطبع مجیدی کانپور	فارسی
27	لیدانے	فقیر اللہ	1293ھ	رسالہ مسائل دینیہ
28	صَرف بہائی	بہاء الدین آملی	وکٹوریہ پریس لاہور	
29	پہلے سیپارے دا ترجمہ	محمد خلیل فیروز والیہ	وکٹوریہ پریس لاہور	بزبان پنجابی منظوم ترجمہ پہلا سیپارہ
30	رسالہ کوٹ ایمان و تفسیر سورۃ رحمان	مولانا غلام کبریا فتح آبادی	مصطفائی پریس لاہور	پنجابی
31	تفسیر سورۃ مزمل (فیض مکمل)	مولوی فیض محمد ساکن کوٹ کنبو شاہ پور	مطبع مصطفائی	پنجابی
32	تفسیر سورۃ ملک راحت المومنین	مولانا محمد عیسیٰ	مطبع محمدی	پنجابی
33	گلستان چوب و قلم	شیخ سعدی	جنوری 1938ء ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور	فارسی
34	فضائل صدقات	مولانا محمد ذکریا	مولوی نصیر الدین ناظم سہارنپور	فارسی
35	علم الصیغہ	مفتی عنایت احمد صاحب	1355ھ مطبع صابر الیکٹرک لاہور	گرامر
36	حیات النبی ﷺ	مصنف نامعلوم	میاں سردار بخش تاجران کتب تلنبہ ضلع ملتان	اُردو
37	عہد رسالت	ابی الفتح محمد بن محمد ترجمہ غلام محمد ہزاردی	1338ھ مطبع روز بازار امرتسر	

38	ظہیر الاسلام	ظہیر احمد شا سیوانی		
39	تفسیر جلد اول رہن مدارک	مولانا عبداللہ بن احمد بن محمود	1405ھ	عربی
40	مرزائیوں سے بائیکاٹ	محمد داؤد پسروری	1343ھ 1925ء مکتبہ الفیض چوک فرید امرتسر	اُردو
41	سراج السالکین	مولانا محمد خلف الرشید مولانا مراد علی	1333ھ درکیس پرنٹنگ لاہور	
42	منتخب مکتوبات قدوسیہ	شیخ عبدالقدوس گنگوہی	1312ھ مطبع مجتبائی واقع دہلی	فارسی، اُردو
43	بیت حضرت بابا فرید، حضرت محرم شاہ بیت حضرت سلطان باہو، مناقب حضرت غوث الاعظم	مصنف نامعلوم	1920ھ ایس سنت سنگھ لاہور	اُردو
44	حقوق الزوجین	سید ابوالاعلیٰ مودودی	1949ء دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور	اُردو
45	احوال الآخرت		در مطبع مصطفائی لاہور	پنجابی، اُردو
46	عجائب القصص (گلزار محمدی) جلد چہارم	مولوی محمد مسلم	مطبع مفید عام لاہور	
47	التبلیغ مسمیٰ بہ عمل الشکر	ارشادات محمد اشرف علی صاحب	مئی 1948 کتب خانہ اشرفیہ کراچی	
48	التبلیغ مسمیٰ بہ التراحم فی التراحم	محمد اشرف علی صاحب	محمد عثمان کتب خانہ اشرفیہ بوہرا نیپیر کراچی	
49	التبلیغ شرط التذکر	محمد اشرف علی صاحب	مئی 1948 اشرفیہ کتب خانہ کراچی	
50	التبلیغ وعظ مسمیٰ بہ بشر الرحمتہ	محمد اشرف علی صاحب	ربیع الثانی 1365ھ کتب خانہ اشرفیہ کراچی	اُردو، مسائل، وعظ تبلیغ
51	التبلیغ وعظ موسوم بہ خیر الاثاث	محمد اشرف علی صاحب	22 شعبان 1355ھ کتب خانہ اشرفیہ کراچی	اُردو، مسائل، وعظ تبلیغ
52	الجناح	محمد اشرف علی صاحب		

53	ہدیہ سنیہ بالدر البیہہ	محمد اشرف علی صاحب		
54	محاسن الاسلام	محمد اشرف علی صاحب	رجب 1364ھ کتب خانہ اشرفیہ کراچی	اُردو، مسائل، وعظ تبلیغ
55	روح المعانی (سورۃ فاتحہ کی تفسیر)	محمد زاہد القادری	حمیدیہ پریس دہلی	
56	سیرۃ الجیب	حافظ محمد عبدالتواب صاحب	مدرسہ امینیہ دہلی	سیرت النبی ﷺ، اُردو
57	تذکرہ السلوک		25 جنوری 1904ء اخبار نیر اعظم مراد آباد	اُردو۔ صفحات 376
58	تعلیم الایمان شرح فقہ اکبر	نجم الغنی خان رامپوری	مطبع نولکشور لکھنؤ	
59	تعلیم الایمان شرح فقہ اکبر (جلد دوم)		1913ء	اُردو صفحات 582
60	فتاویٰ برہنہ جلد اول	مصنف نامعلوم	مطبع حسام واقعہ لاہور	عربی، فارسی، مسائل دینی قدیم ترین صفحات۔ 296
61	فتاویٰ برہنہ جلد دوم	مصنف نامعلوم		
62	القدوری	امام ابوالحسن بن احمد بن محمد بن جعفر	مطبع المحمدی	
63	نسخہ صحیحہ یوسف وزلیخا	نثار احمد بریلوی	1317ھ جوت سنگھ، سادھو سنگھ ڈیرہ اسماعیلخان	صفحات 432 فارسی
64	پند نامہ شیخ فرید الدین عطار	فرید الدین عطار	1321ھ مطبع مفید عام لاہور	
65	طب دلیل العلیل افغانے		1314ھ ہندو پریس دہلی	
66	جواہر الانبیاء	ملا احمد شاہ مرحوم	محمد شریف تاجران کتب پشاور	
67	مقیاس النور	ابوعبدالوہاب محمد عمر اچھرہ لاہور	نامی پریس لاہور	اُردو صفحات 218
68	احوال الآخرت کلاں	مولوی دلپذیر	شیخ سراج الدین لاہور	پنجابی نظم
69	مدرک التنزیل	مولانا عبداللہ بن احمد بن محمود	بہت قدیم سن نامعلوم	تفسیر وترجمہ قرآن/عربی
70	گلستان	حضرت شیخ سعدی	قدیم ترین نسخہ سن نامعلوم	فارسی

71	فوائد شریعت	نامعلوم	صفحات 271	بزبان / پشتو /افغانی
72	مقدمہ جذری بزبان افغانی	مولوی عبدالرحیم امان کوٹی	مطبع فیض عام	پشتو۔ نظم
73	ہزار مسائل افغانی	نامعلوم	1312ھ مطبع ہندو پریس دہلی	پشتو۔ صفحات 60
74	طب نبوی	تحریر نہیں ہے	1266ھ	اُردو۔ صفحات 64
75	شرح رشیدیہ شریفہ	مولوی عبدالوحد تصحیح مولوی ولایت حسین خان صاحب	مطبع خیالی میرٹھ	نسخہ قدیم، صفحات 46۔ عربی
76	اصول الشاشی	مصنف نامعلوم	1847، 1324ھ منشی نولکشور لاہور	نسخہ قدیم۔ بزبان عربی
77	ہدایۃ الاولین	محمد عبدالاحد	مطبع المجتبائی 1936ء دہلی 1332ھ	
78	مجموعہ توضیع کامل افادات سعیدیہ تفقیع ابوسعیدیہ	محمد ابوسعید خان بن محمد عبدالرحمٰن	1372ھ مطبع نظامی کانپور،	
79	ماہوار ''مولوی'' اپریل 56، اگست 56ء	مدیر عبدالحمید خان	محبوب المطابع اُردو بازار دہلی	اُردو زبان
80	دسمبر 56، جولائی 56، مارچ 56، نومبر 57	مدیر عبدالحمید خان	محبوب المطابع اُردو بازار دہلی	اُردو زبان
81	اہتمام جہاد	محمد اکبر خان ڈھوک شرفا، کیمبل پور (اٹک)	فروری 1962ء ملٹری پرنٹنگ پریس کیمبل پور (اٹک)	بزبان اُردو
82	ہدایت النحو مع تعلیقات	سید علی خان مدنی	در مطبع نظامی کانپور	نسخہ قدیم ترین عربی، حاشیہ فارسی
83	تعلیم الایمان، اعظم التفاسیر حصہ اول، بحوالہ تفسیر فیضی	محمد رحیم بخش صاحب دہلوی	نامی گرامی پریس منشی ملاقی داس دہلی	عربی، فارسی، اُردو
84	توجیہہ الایمان اعظم التفاسیر	حافظ محمد رحیم بخش صاحب	در مطبع نامی گرامی منشی بلاقی داس	عربی، فارسی، اُردو
85	نغمہ نور	محمد عبدالصبور بیگ منشور ھزاروی	نقوش پریس لاہور	اُردو
86	اُردو کی پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب، چوتھی کتاب	کتب خانہ انجمن حمایت اسلام	1362ھ 1943ء پنجاب ٹیکسٹ بک کمپنی	اُردو
87	پیکر اعجاز	محمد عبدالصبور بیگ	اکیڈیمک پریس لاہور	اُردو

88	صغریٰ	محمد عبدالصبور بیگ	منشی نولکشور	اُردو
89	مختصر المیزان	میر سید شریف	منشی نولکشور / حاجی سراج الدین	چراغ الدین لاہور
90	پہلا صفحہ غائب		1313ھ	زبان پنجابی، نسخہ و رسم الخط قدیم ترین
91	منیۃ المصلی	مطبو ہندو پریس دہلی 1313ھ	ترجمہ قرآن، افغانی، فارسی	پشتو، فارسی
92	سہ صدی مکتوبات	شیخ شرف الدین یحییٰ منیری	تاریخ خرید پیر صاحب مرحوم 1921ء	
93	صفوت المصادر 1873ء	درسی کتاب برائے مدارس پنجاب	1873 نگر امر	
94	نام حق جلی قلم	1932 1350ھ		
95	قدوری	الحسن بن احمد بن محمد بن جعفر البغدادی	مطبع سردار المطابع دہلی سن نامعلوم	عربی معہ حواشی صفحات 182
96	قلمی نسخہ شاعری (بہت قدیم)	شاعر و کاتب نامعلوم	بزبان پنجابی خوش نویس	اندراج صفحات نہیں ہیں تقریباً 200
97	رحمت اللعالمین جلد اول	قاضی محمد سلیمان منصور پوری	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	اُردو۔ صفحات 478
98	رحمت اللعالمین جلد دوم	قاضی محمد سلیمان منصور پوری	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	اُردو۔ صفحات 478
99	رحمت اللعالمین جلد سوم	قاضی محمد سلیمان منصور پوری	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	اُردو
100	بیان الایمان (شجرہ سلسلہ قادریہ)	عبدالحق صاحب مانکی	مطبوعہ کریمی لاہور سن تالیف نامعلوم	پشتو شاعری۔ صفحات 20
101	بمختصر الوقایۃ	عبیداللہ بن مسعود ابن تاج	1322ھ مطبع نولکشور لکھنو	مسائل فقہ زبان عربی مع حاشیہ
102	دلائل الخیرات مجموعہ وظائف	حضرت شاہ غلام علی صاحب	1904ء تاریخ خرید 13 جیٹھ 1993ء	وظائف بمعہ ترجمہ اُردو صفحات 492
103	دلائل الخیرات	محمود پاشا فانی خان سلطان	1378ھ مکتبہ محمد ضیاء الدین مدینہ منورہ	خرید کتاب 1369ھ 1950ء دوران حج اول صفحات 192

104	نسخہ صحیحہ طب اکبر	حکیم محمد اکبر شاہ ارزانے	مطبع ہندو پریس	موضوع طب زبان عربی صفحات 640
105	کتاب پشتو نظم پہلا صفحہ غائب		نامعلوم	پشتو نظم دینی مسائل بہت قدیم
106	تصنیف بزرگان دین	فقیر محمد سرائے خربوزہ راولپنڈی	1939 ہمدرد سٹیم پریس راولپنڈی	پنجابی نظم
107	شرح عینی کنز شرح کنز الدقائق	حافظ عزیز الدین احمد	مطبع مرتضوی محمد عزیز الدین	مسائل دینیہ جہازی سائز نسخہ قدیم
108	شرح الیاس ربع ثانی		1330ھ مطبع نولکشور مولوی فضل احد پشاور	صفحات 262
109	نسخہ کیمیا	ڈپٹی خان بہادر محمد یوسف خان	جون 1945ء تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور	اُردو۔ صفحات 260
110	معجزات نبوی	علامہ شبلی نعمانی	نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد	اُردو۔ صفحات 227
111	حیات المسلمین	ابراہیم بن محمد الحلبی	دارالاشاعت نزد مولوی مسافر خانہ کراچی	اُردو صفحات 240
112	شرح منیۃ المصلی	ابراہیم بن محمد الحلبی	فی زمانہ سلطان عبدالمجید خان طبع شدہ درکار حلب شام	عربی صفحات 500 سے زائد
113	شرح الفصول	مفتی محمد سعد اللہ رامپوری	1885ء در مطبع علوی محمد علی بخش خان لکھنو	فارسی۔ صفحات 352 قدیم جہازی سائز
114	ماہنامہ ترجمان القرآن	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	مئی 1965ء مکتبہ ترجمان القرآن لاہور	
115	ماہنامہ الحق	مولانا عبدالحق	دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک اکتوبر 1965ء	
116	ماہنامہ پیشوا دہلی، فروری 1940ء، مئی 1940ء، جون 1940ء، اگست 1940ء، اکتوبر 1940ء، دسمبر 940ء	سید عزیز حسن بقائی	اُردو بازار جامع مسجد دہلی	جہازی سائز
117	مرکبات احسانی	حکیم محمد احسان علی خان	پہلی اشاعت 1293ھ، جولائی 1876ء مطبع نولکشور	
118	روضۃ الاصغیاء	مصنف نامعلوم		نسخہ قدیم اُردو صفحات 186

119	گلستان	مصلح الدین سعدی شیرازی	1293ھ مطبع منشی نولکشور	فارسی جہازی سائز، بمعہ حاشیہ فارسی نثر
120	نیدنامہ شیخ فرید الدین عطار	شیخ فرید الدین عطار	10 مارچ 1924ء ملک دین محمد لاہور	فارسی
121	فتنہ انکار حدیث	علامہ حافظ محمد ایوب دہلوی	ادارہ تحقیق حق کراچی	
122	قدوری معہ ترجمہ فارسی، افغانی		مسائل دینیہ	عربی، فارسی، پشتو
123	ماہنامہ مولوی صفر 1376ھ اگست 57	عبدالحمید خان	اگست 57ء اُردو بازار دہلی	
124	دیوان امیر المومنین حضرت علیؓ	ترجمہ مولانا محمد شاہ الدین	ربیع الاول 1364ھ اللہ والے کی قومی دکان لاہور	پنجابی زبان صفحات 381
125	تفریح الحنان تفسیر ام القرآن مع رسالہ حج بیت اللہ کے اسرار	مولوی عبدالقادر ہزاروی اور تعارف مرزا عبدالرحیم بیگ باغدرہ شریف	لیتھو پرنٹنگ پریس لاہور	اُردو۔ صفحات 168
126	معیار الحقائق شرح کنز الدقائق	ضیاء الدین محمد الحسینی	مطبع اسلامیہ واقع لاہور	مسائل دینہ شرعیہ صفحات 686 سائز جہازی
127	مولانا مودوری پر اعتراضات کا علمی جائزہ	مولانا مفتی محمد یوسف	جولائی 1967ء اسلامک پبلیکیشنز لاہور	اُردو۔ صفحات 444
137-128	فتاویٰ ہندیہ، مترجمہ فتاویٰ عالمگیری مکمل 10 جلد	علامہ سید امیر علی مرحوم مئولف تفسیر مواہب الرحمٰن	1932ء باہتمام کیسری داس مطبع نولکشور لکھنو	جہازی سائز
141-138	گنجینۂ طب جلد اول تا چہارم	حاجی محمد اصغر علی خلف حاجی جھنڈو مرحوم لدھیانوی	1927ء کاشی رام پریس لاہور	اُردو۔ صفحات 940
142	مخزنِ اخلاق	رحمت اللہ سبحانی لدھیانوی	1956ء کتابستاب پرنٹنگ پریس	اُردو۔ صفحات 622
143	فضائل حج	مولانا محمد ذکریا صاحب	مظاہر العلوم سہارنپور	اُردو
144	فضائل درود	مولانا محمد ذکریا صاحب	مظاہر العلوم سہارنپور	اُردو
145	ضرورۃ القرآن جلد دوم	قاضی محمد زاہد الحسینی	دارالاشاعت تبلیغ، کیمبلپور (اٹک)	اُردو۔ صفحات 491
146	فلسفہ قرآن مجید در شان نزول فرقان حمید	خواجہ محمد عبدالمجید احمد قادری پیر صاحب دیول شریف	آستانہ عالیہ، خضریہ، قادریہ فیض آباد راولپنڈی	اُردو۔ صفحات 240

سیرت، اخلاق وعادات:

اگرچہ پیر صاحب مرحوم کے بارے میں لکھی گئی تمام تحاریر میں اُن کی زندگی، سیرت اور اخلاق و عادات کے بارے میں کوئی نہ کوئی جھلک ملتی ہے تاہم یہاں پر اُن کی زندگی کے چند پہلوؤں کو مختصر طور پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

سچے عاشق رسول ﷺ:

سچے اور سراپا عاشق رسول ﷺ تھے۔ خلوت وجلوت میں حضور ﷺ کی ذات کا ذکر جس انداز سے کرتے اُس سے ان کے اندرونی جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔ جمعۃ المبارک کے خطبے کے دوران وہ حضور ﷺ کی کسی شان اور نسبت کا ذکر کرتے ہوئے اکثر آبدیدہ ہو جاتے اس سلسلے میں وہ مولانا رومؒ اور شیخ سعدیؒ کی حکایات کا حوالہ دے کر سیرت طیبہ کا ذکر کرتے۔ گستاخیٔ رسول ﷺ کا شائبہ تک برداشت نہ کرتے۔ تاہم آپ کی زندگی میں رواداری بے انتہا تھی۔ کبھی کسی فرقے یا مسلک کو برا بھلا نہیں کہا۔ اگر اختلاف کا ذکر ہو بھی جاتا تو اس میں کسی کی دل شکنی نہ ہوتی۔ اپنے روز مرہ کے ذکر اذکار میں قرآنی سورتوں کی تلاوت اور اسماء الحسنٰی کے علاوہ نبی اکرم ﷺ پر کثرت سے درود وصلوٰۃ آپ کے وردِ زبان رہتا۔

مسلک:

ان کا مسلک وہی تھا جو اُن کے آباواجداد اور جو عوام الناس کا تھا۔ یعنی راسخ العقیدہ اہل سنت و الجماعت۔۔۔ صوفیاء میں سے سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق تھا۔ تصوف اور آستانوں کے سلسلوں سے منسلک ہونے کے باوجود دوسرے مسالک سے کبھی بے جا تعرض نہ کیا۔ کبھی کسی کو برا بھلا نہ کہا۔ آپ کی ذہنی فراخدلی کا ثبوت یہ ہے کہ آپ ہر مسلک کی اچھی کتب کا مطالعہ کرتے اور ان سے کوئی بھی اچھی بات مل جاتی تو اُسے قبول کر لیتے ''اپنے مسلک کو چھوڑو نہیں اور دوسروں کے مسلک کو چھیڑو نہیں'' کے اصول کی آپ زندہ مثال تھے۔ آپ کا مزاج اورغرض علامہ اقبالؒ کے ان اشعار پر پورا اترتا تھا۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں	ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں	چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تیری تحریر سے	دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تیری تقریر سے
پاک رکھ اپنی زباں، تلمیذِ رحمانی ہے تُو	ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

رزق حلال کی کمائی:

عقیدتمندوں اور مریدین کی ایک بڑی تعداد ہونے کے باوجود اپنے لیے رزق حلال اپنے ہاتھوں سے کماتے۔ میری یاد سے پہلے یعنی اپنی عین جوانی میں کاروبار بھی کیا۔ میرے لڑکپن میں اپنی زمینوں میں اپنے ہاتھ سے کاشتکاری کرتے رہے۔ معاشی وسیلہ کے طور پر لنگر اور گکھڑ کے درمیان میں نالہ ننڈنا کے اوپر زمین خرید کر ایک پن چکی تعمیر کی جو بعد ازاں ہمارے خاندان کے معاشی اور رزق کے مسائل حل کرنے میں رحمت خداوندی ثابت ہوئی۔ سرکاری نوکری اور کوئی جاب نہ ہونے کے باوجود اس (پن چکی) اور زمین سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ ہمارے سب بہن بھائیوں کے تعلیمی اخراجات پورے ہونے کے علاوہ غریب غرباء، حاجتمندوں اور مسافروں کی مدد بھی ہو جاتی تھی۔

سخاوت اور دریا دلی:

آپ طبیعت میں بہت سخی واقع ہوئے تھے۔ جیب میں ہر وقت رقم موجود ہوتی اور کسی بھی حاجتمند کی بوقت ضرورت مدد کر سکتے تھے۔ اکثر شہر جاتے تو اپنے ساتھ دوائیاں خرید لیتے اور بلاتفریق امیر وغریب ہر بیمار کو دوا مفت مہیا فرماتے۔ قرض حسنہ ایسے لوگوں کو بھی دے دیتے تھے جن سے واپسی کی اُمید بھی نہیں ہوتی تھی۔ گاؤں کی مساجد کی ضروریات بھی سب سے پہلے اپنی جیب سے ادا کرتے۔ مہمان نوازی جیسے ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ مہمان کی خدمت اپنی اوقات سے بڑھ کر کرتے تھے۔ گاؤں کی انتہائی غریب عورتیں اپنی حاجات ہماری والدہ کے ذریعے آپ تک پہنچاتیں اور آپ ان کی حاجات کو پورا کرنے میں ایک پل دیر نہ کرتے۔

ہمیں سکول کے سبق میں حوصلہ افزائی کے لیے اکثر انعامات سے نوازا کرتے۔ کسی بھی چھوٹی بڑی کامیابی پر ہمیں نقد رقم یا تحفہ مثلاً پین، کاپی وغیرہ سے نوازتے اور یہ سلسلہ آگے ہمارے بچوں (آپ کے پوتوں) تک جاری رہا۔ مسافروں کے ذکر سے یاد آیا۔۔۔۔۔۔ اُس زمانے میں مسافروں کا ٹھکانہ گاؤں کی مساجد میں ہوتا تھا۔ ہماری مسجد پرانے زمانے کے چُونے سے بنی ہوئی پکی مسجد تھی لیکن چھت کچی اور لکڑی کے ''بالوں'' سے بنی ہوئی تھی۔ اگلے والا کمرہ بڑا ہال تھا اور کچا ہونے کی وجہ سے سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈا ہوتا تھا۔ فرش پر ایک خاص قسم کی گھاس بچھائی جاتی جو پائیدار ہونے کے ساتھ ساتھ نرم اور گرم بھی ہوتی تھی اور کئی سال تک اس کو تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ باہر سے آنے والے مسافر اکثر پھیری لگانے والے، کپڑا، سرمہ اور سنگھار کا سامان، چٹائیاں، ایلومنیم کے برتن، برتنوں کو مانجھنے اور قلعی کرنے والے ہوتے تھے۔ جو دن کے وقت پھیرے لگا کر اپنا سامان بیچتے تو رات کو مسجد میں قیام کرتے۔ اُن میں زیادہ تر پٹھان (غلزئی قبیلے کے لوگ جو آجکل اٹک شہر میں متمول بزنس مین ہیں اور اُن کا شمار اٹک کے بڑے تاجروں میں ہوتا ہے) اور ایک بابا پراچہ نام کا شخص تھا جو اکثر دن کو ہی پھیرا لگا کر چلا جاتا۔ ہمارے والد بزرگوار کی عادت تھی کہ مغرب کی نماز کے بعد جب گھر آتے تو ہماری بے جی (والدہ محترمہ) سے کہہ دیتے کہ ایک دو یا تین مسافروں کا کھانا بھجوا دیں۔ بے جی اس اچانک افتاد پر گھبرا جاتیں لیکن پھر وہ عادی ہو گئیں اور ہفتے میں ایک دو دن مسافروں کے لیے کھانا بھجوانا ایک روٹین بن گیا۔ اور اُس وقت تک رہا جب تک کہ سائیکلیں اور آمدورفت کے دیگر ذرائع وجود میں آ گئے اور یہ لوگ دن کو پھیرا لگا کر شام تک اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتے۔

ہمہ جہت شخصیت:

پیر صاحب کو آپ ایک ہمہ جہت شخصیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ بیک وقت ایک مذہبی پیشوا، ایک سکالر، سیاستدان، عمائد علاقہ، تاجر، حکیم اور زمیندار (کاشتکار) کتب اور اخبار بینی کے شوقین اور سیاح بھی تھے۔ خاندان سادات پیر سباک کے ایک معزز رکن ہونے کے علاوہ اٹک، بنوں، لکی

مروت میں اُن کے بے شمار عقیدت مند (مریدین) موجود تھے۔ اور خود ایک آستانہ عالیہ سالک آباد شریف کے خلیفہ خاص تھے۔ تاہم آپ نے اپنے زندگی میں کوئی خاص آستانہ اور گدی وغیرہ قائم نہیں کی بلکہ اپنے عقیدتمندوں اور مریدوں کے ساتھ تعلق کو دعاؤں اور پند و نصائح تک محدود رکھا تو ہم پرستی، گنڈوں، جادو اور نجومیت وغیرہ جیسے اشغال سے مکمل اجتناب کرتے۔

زاہد شب بیدار:

پیر صاحب کا بچپن اپنے زاہد و پرہیز گار حاجی الحرمین والد کی زیرِ نگرانی پاکیزگی اور ادائیگی نماز و فرائض میں گزرا۔ جوانی کے دور سے اپنے مرشد کی ہدایت پر چلہ کشی کی اور پھر مستقل طور پر ایک تہجد گزار اور زاہد شب بیدار کی زندگی گزاری۔ صبح اندھیرے منہ اٹھنا، باقاعدگی سے تہجد اور مسجد میں صبح کی اذان خود دینا ان کا معمول تھا۔ ہم نے سوائے ان کی آخری عمر کی شدید علالت کے کبھی اُن کے معمولات میں فرق نہیں دیکھا۔ دن کے بیشتر وقت وہ باوضو ہوتے اور کھانے پینے اور آرام کے اوقات میں بھی ذکر اذکار اور قرآن پاک کی مشہور سورتوں کی تلاوت اُن کی زبان پر رہتی اور کبھی کبھی سورۃ مزمل اور سورۃ رحمان کی آیات کی آواز ہمارے کانوں تک بھی پہنچ جاتی۔ ہم اکثر ذکر اذکار کے وقت اُن کے سامنے خاموش بیٹھے ہوتے تھے۔ بہت ہی بچپن میں اگر شرارت پہ دل کرتا تو ہم چپکے سے اُن کے سامنے سے کھسک جاتے مگر اُن کے سامنے کبھی اُونچی آواز سے بولنے اور بے جا شور وغل کی جراءت نہیں ہوئی۔

لباس و معمولات زندگی:

آپ لباس کے طور پر عموماً ایک سفید لمبی قمیض اور چوڑی شلوار زیب تن فرماتے۔ سر پر سفید پگڑی اور پگڑی کے اُوپر سفید چادر ہوتی۔ بہت ابتدا میں (جیسا کہ ہم نے بچپن میں اُن کو دیکھا) سفید پگڑی کے اُوپر سفید چادر کو اس طرح اوڑھ لیتے کہ راستے میں جاتے ہوئے ان کا چہرہ بہت کم ہی نظر آتا تھا۔ سردیوں میں کمبل یا گرم چادر بھی اوڑھ لیتے تھے اور سیاہ واسکٹ یا کبھی کبھی لمبا کوٹ بھی زیب تن کرتے۔ پاؤں میں سردی گرمی میں بوٹ یا گرگابی پہنتے تھے۔ آپ کے دائیں ہاتھ میں دائمی طور پر چاندی کی انگوٹھی ہوتی تھی

جس میں فیروزے (پتھر) کا نگینہ ہوتا تھا جو آپ کے جسم پر ایک عجیب قسم کے تقدس کا تاثر پیدا کرتا۔ گھر سے باہر جاتے ہوئے آپ کے ہاتھ میں عصا ضرور ہوتا تھا جس کو آپ کبھی سہارے کے طور پر نہیں بلکہ سنت رسول ﷺ کے طور پر سفر میں اپنے ساتھ رکھتے۔ خوبصورت گرم چادریں گاؤں کے جولاہے بنتے تھے جو اکثر محبت سے آپ کو تحفتاً بھی پیش کرتے۔

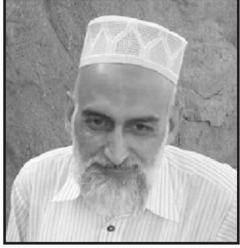
لباس کی وجہ سے آپ کی شخصیت بھاری بھرکم شخص کی لگتی تھی مگر اندر سے ان کے جسم پر گوشت کی مقدار اتنی کم تھی کہ وہ بجا طور پر ایک دبلے پتلے اور جسمانی طور پر نحیف ونزار شخص کہلا سکتے تھے۔ اس بات کا پتہ ہمیں اُس وقت چلتا جب ان کے سفر سے واپس آنے کے بعد ہم ان کے پاؤں اور ٹانگیں دباتے۔ شاید اسی جسمانی توازن کی وجہ سے طویل پیدل سفر ان کا معمول تھا۔ لنگر و گکھڑ کے درمیان 6 کلومیٹر فاصلے کا پیدل پہاڑی سفر آپ کا معمول تھا اور بسوں اور سڑکوں کی تعمیر سے قبل وہ اس سے بھی طویل سفر آسانی سے طے کر سکتے تھے۔ سفر کے دوران ان کی رفتار اپنے ہمراہیوں سے تیز ہوتی مگر محسوس نہیں ہوتا کہ وہ تیز رفتاری سے چل رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے لڑکپن بلکہ جوانی کے دور میں بھی ہم اُن کے ساتھ پیدل نہیں چل سکتے تھے اور اگر اُن کے ساتھ پیدل سفر کرنا پڑ جاتا تو بچھڑ بچھڑ کر ملتے تھے۔

راقم کو کالا باغ سے موضع تبی سرنز دشکردرہ (کوہاٹ) کا 18 میل (تقریباً 28 کلومیٹر) کا پیدل سفر یاد ہے راقم اُس وقت نویں جماعت کا طالب علم تھا اور اپنی اکلوتی پھوپھی سے ملنے والد صاحب کے ہمراہ پہلی مرتبہ ان کے گاؤں جا رہا تھا۔ میں کئی بار چلتے چلتے اُن سے بچھڑ جاتا اور وہ دور آگے جا کر رک جاتے اور میرا انتظار کرتے۔ میرے اُن تک پہنچنے پر میرا حوصلہ بڑھانے کے لئے مذاقاً کہتے کہ اچھا اگر آگے کا سفر فلاں جگہ تک رہ گیا ہو تو آپ طے کر سکو گے تو میں ہاں میں جواب دیتا اور اگلا سفر پھر شروع ہو جاتا اور اس طرح کرتے کرتے اٹھارہ میل کا کٹھن سفر ختم ہوا۔ سفر کے خاتمے پر میں نڈھال تھا اور آپ اُسی طرح ہشاش بشاش تھے۔

__☆☆___☆☆___☆☆__

جی اُری

ڈاکٹر اسد حسین شاہ



پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ھیں۔ اٹک کی ایک مشھور نجی ھسپتال میں ایک ماھر سرجن اور ایڈ منسٹریٹر ھیں۔ میرے بڑے بھائی اور میرے محسن، میرے مربی سید محمد حسین شاہ کے صاحبزادے ھیں۔ رشتے میں قبلہ پیر صاحب مرحوم کے پوتے ھیں مگر اپنی بچپن کی یاداشتوں کو قلمبند کر کے جس طرح پیش کیا ھے وہ آپ کے سامنے ھے میری نظر میں اُن کی پھلی باقاعدہ تحریر ھے۔ جس میں انھوں نے ایک تسلیم قلمکار ھونے کا ثبوت پیش کر دیا۔ شاید یہ ان کی اپنے دادا کے لیے معصوم محبت اور ان کی روحانی برکات کا نتیجہ ھے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

سرخ و سپید رنگت، روشن آنکھیں، سفید داڑھی، سر پر ٹوپی یا عمامہ پہننے کے بعد سفید چادر سر پر یوں اوڑھ لیتے تھے کہ ٹوپی یا عمامہ کم ہی نظر آتا تھا۔ میانہ قامت، کھلے شانوں کے ساتھ بالکل سیدھی کمر، کہیں دور جانا ہوتا تو ہاتھ میں عصا ضرور لیتے تھے لیکن عصا کے سہارے چلتے نہیں تھے کہ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی وہ تو محض اسلئے ساتھ رکھتے تھے کہ ان کے جدامجد بھی رکھا کرتے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیوں میں ایک یا دو انگوٹھیاں، ایک میں فیروزہ اور ایک میں عقیق مجھے یاد ہے۔ ان پتھروں کے نام بھی مجھے پہلی دفعہ ان سے ہی معلوم ہوئے تھے۔ انگوٹھیاں پہننے کی وجہ بھی وہی تھی جو عصا رکھنے کی تھی چال میں میانہ روی لیکن تیزی کی طرف مائل۔ اگر دور سے اکیلے آرہے ہوں تو آسانی سے پہچانے جاتے تھے اور اگر ہجوم میں ہوں تو مزید آسانی سے کیونکہ ان جیسا اور کوئی ہوتا ہی نہیں تھا۔ بڑھاپے میں اس قدر وجیہہ شخص میں نے ان کے علاوہ اور کوئی نہیں دیکھا۔ "چہرے پہ نور ہوتا" ایک ایسی اصطلاح جس کی الفاظ میں مزید وضاحت ممکن نہیں ہے یہ تجربے کی چیز ہے ان کے بارے میں بہت لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ ان کے چہرے پہ اس قدر نور ہے کہ اس کا تحمل مشکل ہو جاتا ہے۔

عموماً سفید لباس ہی پہنتے تھے سو دیکھنے میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ سر سے پاؤں تک ان سے سفیدی کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔ بات بہت وقار اور تحمل سے کرتے تھے۔ کسی کی بات کو کاٹتے میں نے ان کو نہیں دیکھا۔ محفل کے آدمی تھے مسجد ہو یا بیٹھک، ان کے آس پاس لوگوں کی محفل رہا کرتی تھی میں نے بارہا دیکھا کہ ان کی محفل میں لوگ اپنی اپنی بات کر رہے ہیں۔ جب سب اپنی کہہ چکتے تو وہ اپنی بات شروع کرتے اور پھر یوں محسوس ہوتا گویا ان کے آس پاس کا سارا ماحول در و دیوار، اور سب لوگ ان کی بات سننے کے ہی منتظر تھے۔ ان کی گفتگو سے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ لیکچر نہیں دیتے تھے، چاہے گفتگو طویل بھی ہو جائے طویل نہیں لگتی تھی، مخاطب کو ان کی گفتگو کے ہر لفظ سے اپنائیت کا ایک رواں احساس رہتا تھا۔ کسی کا مسئلہ ذاتی نوعیت کا ہو یا سیاسی نوعیت کا سوال مذہب کے بارے میں ہو یا کاروبار کے بارے میں، جسمانی صحت کا کوئی معاملہ زیر بحث ہو یا کوئی نفسیاتی عارضہ۔ لوگ ان سے ہر قسم کی بات بلا جھجک کر سکتے تھے اور بخدا ان کے دامن میں ہر کسی کے فائدے کا سامان موجود ہوتا تھا۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ان کو ایک ہی نام سے پکارا "جی اُری"۔ یہ لفظ بھی ایک خاص تہذیب اور ادب کے ارتقا کے نتیجے سے پیدا ہوا۔ وہ میرے دادا تھے۔ اب ادب اس بات کا متقاضی کہ دادا کو صرف دادا نہیں کہا جا سکتا۔ سو دادا کے ساتھ جی کا لفظ شامل کیجئے۔ اب ادب نے ایک قدم آگے بڑھایا تو یہ بھی ناکافی محسوس ہوا تو اب ایک لفظ مزید شامل ہو گیا۔ مقامی زبان میں "اُری"۔ جیسے اردو میں تمام القاب کے بعد صاحب کا لفظ سمجھ لیجئے۔ سو اب مخاطب کرنے کے لیے پورا لفظ دادا جی اُری ہو گیا ۔لیکن ادائیگی میں طوالت سے بچنے کے لیے ایک لفظ منہا کر دیا اور "جی اُری" رہ گیا۔ گاؤں کے لوگ انہیں پیر جی یا وڈے پیر کہتے تھے میرے نانا کے خاندان کے لوگوں کے لیے وہ حاجی صاحب تھے اور خود اپنے بقول فقط فقیر محمد علی شاہ۔ ان کے والد کا نام میاں گل شاہ اور والدہ کا نام فیروزہ بی بی تھا۔ یہ معلومات مجھے اپنی اماں جی سے حاصل ہوئیں۔

دادا جی (اب میں قارئین کی سہولت کے لیے اسی نام سے یاد کروں گا) ہمارے گھر کے ساتھ کی مسجد میں امامت اور خطابت کے فرائض سر انجام دیتے تھے۔ حکمت (یونانی طب "Herbal

"Medicine") میں بھی خاص مہارت رکھتے تھے۔ اپنے گاؤں اور ارد گرد کے دیہات سے بھی لوگ اپنی امراض کے علاج کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ اور شفایاب ہوتے تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی ایک پیشہ ور حکیم یا طبیب کی شہرت قبول نہیں کی اور نہ ہی کبھی اپنی خدمت کا کسی سے معاوضہ لیا۔ بس مریض کو نسخہ لکھ دیتے کہ فلاں فلاں چیزیں بازار سے لیکر اس طریقے پر دوائی تیار کر لو۔ اگر نہ کر سکو تو یہ چیزیں لا کر مجھے دو میں تیار کر دوں گا۔

تصوف سے گہرا اشتغال تھا۔ لوگوں کو بلا معاوضہ تعویز بھی لکھ دیتے اور دم بھی کر دیتے۔ کسی کا کوئی مسئلہ ہو دینی یا دنیاوی۔ ان کے پاس اس کا کوئی نہ کوئی تسلی بخش حل موجود ہوتا تھا۔

میرے تو دادا جی تھے اور میں ان کا لاڈلا پوتا۔ ان کے دامنِ عافیت میں پلا بڑھا ایک دادا پوتے کی بے تکلفی بھی ہمہ وقت رہتی تھی جس کا میں جائز ناجائز فائدہ بھی اٹھاتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ہمارے ہمسائے میں ایک گھر تھا جہاں میں اکثر کھیلنے کے لیے چلا جاتا تھا۔ وہ گھر ایک بہت ہی شفیق اور نیک خاتون اماں جی بی رحیماں کا تھا۔ ہمارا ان کے ساتھ قریبی خاندانی رشتہ تھا۔ موصوفہ بھی ایک ایسی شخصیت تھیں کہ ان کا ذکر بھی ایک مکمل مضمون کا متقاضی ہے۔ بہر حال قصہ مختصر اماں جی بی رحیماں کے گھر ایک بوڑھی میراثن اپنی ڈھولک لیکر آگئی۔ ڈھولک اس نے کمرے کی دیوار پہ کھونٹی سے لٹکا دی اور اماں جی کے پاس بیٹھ گئی۔ میں نے جو ڈھولک دیکھی تو میرا دل مچل گیا اور میں نے ضد شروع کر دی کہ میں نے ڈھولک بجانی ہے۔ بوڑھی میراثن بیچاری کی جان پر بن آئی کہ اگر چھوٹے پیر کو ڈھولک دے دیتی ہوں تو بعد میں بڑے پیر صاحب تک بات پہنچ جائے گی اور سرزنش ہو جائے گی کہ ہمارے پوتے کو کیوں خراب کیا۔ سو اس نے مجھے ڈھولک دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور روتے روتے سیدھا جا کے دادا جی کو شکایت کی کہ اماں بختاں مجھے ڈھولک نہیں دے رہی۔ سب گھر والے پریشان کہ آج کیا ہوگا۔ یہی سوچ رہے ہونگے کہ لاڈلے پوتے کو آج ایک عالم، خطیب، باشرع دادا سے ڈانٹ پڑنے والی ہے۔ لیکن ہوا کچھ یوں کہ میرے دادا اٹھے میرا ہاتھ پکڑا اور سیدھے اماں جی بھی رحیماں کے دروازے پر۔ اجازت لے کر اندر داخل ہوئے تو وہ دونوں بوڑھی خواتین بسم اللہ بسم اللہ

کرتی ہوئی آ گئیں۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے کہ اچانک دادا جی مسکرا کے بوڑھی میراثن سے مخاطب ہوئے " کیوں بھئی بختاں، تم ہمارے پوتے کو ڈھولک کیوں نہیں دیتی ہو"۔ اس بیچاری کی جان میں جان آئی "جی ضرور جی کیوں نہیں" کہتی ہوئی گئی اور ڈھولک لا کر میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے ڈھولک پہ دو چار ہاتھ مارے اور خوش ہو گیا۔

ان کی لائبریری میں سے کتابیں نکال کر پڑھنا میرا مشغلہ تھا۔ ان کی لائبریری میں زیادہ تر کتب وہی تھیں جو عموماً علماء کی لائبریری میں ہو سکتی ہیں۔ قرآن کی تفاسیر، حدیث کے ذخائر، فقہ کے مسائل اب اس قسم کی کتب ایک سات آٹھ سال کے بچے کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ ان سے جتنا علم کشید کر سکتا ہے میں نے بھی اتنا ہی کیا لیکن مجھے سہولت یہ حاصل تھی کہ میں کوئی نہ کوئی سوال لے کے ان کے پاس بیٹھ جاتا اور ان سے پوچھتا اور وہ انتہائی شفقت سے میرے الٹے سیدھے سوالات سنتے اور میری ذہنی سطح کے مطابق جواب دے دیتے۔ مشکل سوالات، خصوصاً اختلافی مسائل کا جواب دینے کی ان میں خداداد صلاحیت تھی۔

ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا، کہ قائداعظم محمد علی جناح کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ اب یہ سوال میں کسی عام آدمی یا کسی سکول ٹیچر سے پوچھتا تو وہی جواب ہوتا جو میری درسی کتب میں لکھا ہوا تھا۔ سو میرے سوال کا مقصد کچھ اور تھا یہ ایک عالم باعمل سے ایسی شخصیت کے بارے میں سوال تھا۔ جو ایک باکمال سیاسی رہنما تو تھے لیکن روایتی مذہبی شخصیت ہرگز نہ تھے۔ اور جن کے بارے میں مذہبی حلقوں میں ایک خاص قسم کی کراہت یا ناپسندیدگی پائی جاتی تھی دادا جی نے جو جواب دیا وہ میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا فرمانے لگے "بیٹا، میں جناح کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا تھا کہ کوئی انگریز ٹائپ کا سیاسی لیڈر رہے اور جس نے ایک نئے ملک کی بنیاد رکھ دی۔ لیکن اس کے لیے میرے دل میں کوئی نسبت یا لگاؤ ہرگز نہیں تھا۔ لیکن پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ۱۹۵۰ میں مجھے سفر حج پر جانے کی سعادت حاصل ہوگئی میں نے بذریعہ بحری جہاز جانا تھا اسلیئے پہلی منزل کراچی تھا۔ جب کراچی پہنچا تو دل چاہا کہ اس شہر کو گھوم پھر کے دیکھ لیا جائے۔ سن رکھا تھا کہ جناح کا انتقال ہو چکا ہے اور ان کی تدفین اسی شہر میں ہوئی ہے سو میں نے سوچا چلو نئے ملک کے بانی کی قبر بھی دیکھ لی جائے۔ سو میں ان کی قبر پر چلا گیا۔ حسب عادت فاتحہ پڑھی اور واپس چل پڑا لیکن اچانک یوں

محسوس ہوا جیسے میرے قدموں نے چلنے سے انکار کر دیا ہو۔ یا زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے ہوں اور میرے اندر سے جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ ٹھہرو تم ایسے نہیں جا سکتے یہ کوئی عام آدمی کی قبر نہیں ہے کہ فاتحہ پڑھی اور چل دیے۔ میں نے قبر کے آس پاس دیکھا تو ایک جگہ قرآن کے سپارے رکھے ہوئے تھے میں واپس قبر کے پاس آیا سپارہ اٹھایا اور تلاوت شروع کر دی۔ کئی سپارے تلاوت کرنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اب مجھے واپسی کی اجازت مل گئی ہے۔ تو اس دن مجھے اس بات پہ شرح صدر ہو گیا ہے جناح خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے ہے اور اب میرا ان کے بارے میں یہی خیال ہے"۔

میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ میری زندگی کے ابتدائی سالوں میں مجھے مستقل ان کا فیض صحبت حاصل رہا۔ ان سے میں نے کیا کچھ حاصل کیا اسکا احاطہ تو ممکن نہیں ہے صرف چند مثالیں ہی پیش کی جا سکتی ہیں۔ میرے ننھیال کے گاؤں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جو اس وقت میرے لیے بہت ہی حیران کن تھا۔ اس گاؤں میں ایک خاص بات تھی کہ یہاں جمعہ اور عید کی نماز صرف ایک ہی مسجد کے امام پڑھاتے تھے جو پورے گاؤں کی مرکزی جامع مسجد تھی۔ ہر مذہبی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ بخوشی اس مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرتے تھے۔ بریلوی، دیوبندی تو چھوڑیے شیعہ اور اہلحدیث حضرات بھی اس مسجد میں جمعہ کی نماز میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ پھر اچانک کیا ہوا کہ ایک اختلافی مسئلہ پر دو گروپ بن گئے، اور جامع مسجد ایک کی بجائے دو ہو گئیں اور اختلافی مسئلہ صرف اتنا سا تھا کہ حرف "ض" کی ادائیگی کیسے ہو اس کو "زواد" پڑھا جائے یا "دواد" لیجئے صاحب اس موضوع پر دو گروپ بن گئے اختلاف بڑھ گیا اور اگلے جمعہ پہ دو مساجد میں نماز جمعہ کا اہتمام ہو گیا۔ دونوں گروپوں نے اپنے اپنے حمایتی علماء کو اکٹھا کر لیا اور دونوں مساجد میں زور شور سے اپنے اپنے نقطہ نظر کے حق میں تقریریں شروع ہو گئیں اور انتہا یہ ہوئی کہ ہر فریق نے اپنے مخالف فریق پہ یہ فتویٰ جڑ دیا کہ وہ اس ایک حرف کو صحیح طور پر ادا نہ کرنے کی وجہ سے قرآن میں تحریف کے مجرم ہیں اور قرآن میں تحریف کفر ہے لہٰذا کفر تو کافروں کو ہی زیبا ہے۔ بس اسکے بعد صلح کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے اور نماز جمعہ کا اجتماع جو کہ پورے گاؤں کے اتحاد کا واحد مظہر تھا وہ بھی تقسیم در تقسیم کے مراحل میں داخل ہو گیا۔

آج کل خیر سے تین جگہ جمعہ کی نماز ادا ہوتی ہے اسی طرح نماز عیدین بھی۔ میرے لیے یہ واقعہ بہت جھنجلاہٹ کا باعث تھا۔ میری سمجھ سے یہ بات بالا تھی کہ ان میں سے کون حق پہ ہے میری دادا جی سے ملاقات ہوئی تو میں نے یہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ اور انہوں نے لمحوں میں میری تشفی کر دی فرمانے لگے "بیٹا یہ مسئلہ کوئی نیا نہیں ہے جب میں حج کے موقع پر حرم میں تھا تو بنوں کے علاقے سے میرے ایک رشتہ دار نے مجھے چٹھی بھیجی کہ ان کے علاقے کے علماء کا اسی مسئلہ پر اختلاف ہو گیا ہے اور اسی طرح کفر کے فتوے لگ رہے ہیں تو انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں امام کعبہ سے اس مسئلہ کی بابت دریافت کروں۔ اس زمانے میں حجاج کرام کا اتنا رش نہیں ہوتا تھا اور امام کعبہ اکثر نماز کے بعد لوگوں کو آسانی سے مل لیا کرتے تھے سو میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ان سے یہ سوال پوچھ لیا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ میں تلاوت کرتا ہوں، تم سنو۔ سو انہوں نے غالباً سورۃ فاتحہ کی آخری آیت کی تلاوت کی جس میں یہ حرف دو دفعہ آتا ہے۔ "**غير المغضوب عليهم والضالين**" میں نے سنا اور عرض کیا کہ یہ تو نہ "زواد" ہے اور نہ "دواد" حرف کا مخرج ز، ظ، ذ یا د سے تو نہیں ہو سکتا یہ علیحدہ حرف ہے اب اسکا مخرج بھی علیحدہ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضور یہ تو صرف اہل زبان ہی ادا کر سکتے ہیں اور ہم تو ٹھہرے عجم کے باسی، ہم کیا کریں۔ تو امام کعبہ نے مجھ سے سوال کیا "بتاؤ المنجد (عربی کی اس زمانے کی بڑی لغت تھی) کا مصنف عربی ہے یا عجمی"۔ میں نے عرض کیا "عجمی" پھر فرمانے لگے "امام بخاری عربی تھے یا عجمی" میں نے عرض کیا "عجمی"۔

اس پر امام کعبہ نے میری ہلکی سے سرزنش کی کہ اپنی کاہلی کے لیے جواز مت تلاش کیا کرو۔ تھوڑی سی محنت کر کے صحیح مخرج کے ساتھ تلاوت کرنا سیکھو اور جب تک نہ سیکھ پاؤ۔ جیسے سمجھ میں آئے ادا کرو۔ اللہ تعالیٰ انسان کی نیتوں سے واقف ہے۔ تمہاری نیت کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ تم نے "ض" ہی سوچ کر ادا کیا چاہے جیسے بھی ادا کیا، بس اتنا کافی ہے۔

اللہ کی کریم ذات نے ان کو ہر قسم کی بدگمانی اور تفرقہ پسندی سے دور رکھا تھا۔ میں نے کبھی ان کو مخالف مکاتب فکر کی تکفیر کرتے نہیں سنا۔ اپنی رائے دلیل سے پیش کر کے خاموش ہو جاتے تھے اور

دوسرے کے دلائل کو خندہ پیشانی سے سنتے تھے اور علماء حق کو یہی رویہ زیب دیتا ہے۔

دیگر سماجی، دنیاوی یا سیاسی مسائل پر بھی ان کا رویہ اور نقطہ نظر ان کی سلیم الفطرت شخصیت کے عین مطابق ہوتا تھا۔ دوسروں کی دل آزاری سے ہر ممکن اجتناب کرتے تھے اور اسی کا ثمر تھا کہ میں نے ان کے مخالفین کے منہ سے بھی ہمیشہ ان کا ذکر انتہائی احترام اور تعریف کے لہجے میں سنا۔

حکمت کے ساتھ نصیحت کرنا، ان کا خاص وصف تھا۔ محترم چچا جان سید عنائت حسین شاہ نے ایک واقعہ روایت کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں والد محترم کے ساتھ پیدل سفر پر تھا۔ رستے میں ایک جگہ ایک نہر یا پہاڑی نالے سے گزر ہوا۔ پانی سے گزرنے کے لیے بیچوں بیچ بڑے بڑے پتھر رکھ کے راستہ بنایا گیا تھا۔ جن پر پاؤں رکھ کے ہم گزر رہے تھے۔ والد محترم آگے تھے اور میں حسب عادت پیچھے کہ اچانک ان کا قدم ڈگمگایا۔ لیکن میں نے ہاتھ بڑھا کے ان کو سہارا دیا اور ہم بخیریت نالے کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ جب ہم نالے کے پار پہنچے تو انہوں نے مجھ سے فرمایا "عنایت حسین بیٹھو میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ انسان شکوہ کرتا ہے کہ میرا بیٹا، بیٹی، داماد، بہو وغیرہ میرا ساتھ نہیں دیتے۔ مجھے چھوڑ گئے، میری توقعات پہ پورے نہیں اترے وغیرہ۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ یہی دنیا کی حقیقت ہے۔ جب میں جوان تھا اور اسی نالے سے گزرتا تھا انہیں پتھروں پر میرے قدم پڑتے تھے اور اگر کوئی پتھر پاؤں کے نیچے سے سرکتا تھا تو میں اپنے پاؤں کے زور سے اس کو ٹھہرا لیتا تھا اور پتھر میرے پاؤں کے نیچے سے ہل نہیں سکتا تھا اور آج یہ کیفیت ہے کہ ایک پتھر میں ذرا سی لرزش پیدا ہوئی تو میں گرنے لگا تھا کہ تم نے مجھے سہارا دیا۔

دیکھ لو آج میرے پاؤں کی قوت، میرے بدن کی طاقت میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں اور وہ دن قریب ہے کہ یہ بدن جس کے ہر عضو کو میں اپنی ملکیت سمجھتا ہوں میرا ساتھ چھوڑ دے گا۔ ارے بھائی جب میرے اعضاء بدن ہی میرا ساتھ ہمیشہ نہیں دے سکتا تو دوسروں سے کیا شکوہ"۔

دادا جی کے حلقہ یاراں کے لوگ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ روحانیت کے میدان میں وہ خصوصی مقام پر فائز تھے۔ لیکن خود وہ کبھی اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ یہ ان کے رب اور ان کے درمیان ایک راز ہی تھا۔ بس کبھی اشارہ اپنی بیٹی (ہماری لاڈلی اور اکلوتی پھوپھو) کو کوئی بات بتا

دیتے تھے۔مبشرات یعنی صالحین کو خواب کے ذریعے کوئی معلومات دینے کا سلسلہ شریعت مطہرہ کے مطابق ایک حقیقت ہے اور اس سلسلہ کے تجربات زندگی بھر ان کو ہوتے رہے لیکن وہ عموماً اس کو بیان نہیں کرتے تھے۔ اپنے پہلے حج سے پہلے ان کو خواب کے ذریعے جو بشارت دی گئی تھی وہ مجھ سے انہوں نے بیان کی تھی۔

عبادات میں استقامت ان کی کرامت تھی فرض نماز کا قضا ہونا تو دور کی بات نماز با جماعت سے بھی وہ شاید ہی کبھی زندگی میں محروم ہوئے ہوں تہجد اور اشراق کے نوافل ہمیشہ پڑھتے۔

خدا کا ذکر کسی نہ کسی صورت میں ان کی زبان پر ہمیشہ جاری رہتا۔ رمضان کے مہینے میں معتکف ہوتے۔سخت سے سخت گرمیوں کے روزوں میں بھی افطار کے وقت میں نے ان کی طبیعت میں بھوک یا پیاس کی وجہ سے بے چینی نہیں دیکھی۔بس ایک گلاس پانی یا شربت پی کے سیراب ہوجاتے۔

برکت کا لفظ اپنے پورے مفہوم کے ساتھ ان پر صادق آتا تھا انتہائی محدود وسائل رزق کے باوجود ایک بڑے خاندان کو پالا پوسا۔خدا نے کثیر اولاد سے نوازا تھا۔نو بیٹے اور ایک بیٹی سب کی پرورش کی، پڑھایا لکھایا، شادیاں کیں اور آج سب خوش وخرم اور خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دادا جی نے دو شادیاں کی تھیں اور دونوں سے خدا نے اولاد سے نوازا تھا بچوں میں آپس کا اتفاق اور انس اس قدر تھا کہ ہمیں ہوش سنبھالنے تک کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ ہمارے کوئی چچا سوتیلے ہیں محبت اور عزت کے حوالے سے سگے اور سوتیلے میں اب بھی کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

مہمان نوازی ان کا خاصہ تھا، رشتہ داروں، دوستوں اور مریدوں کے لیے تو ان کا دستر خوان ہمیشہ کھلا ہی رہتا تھا اگر گاؤں میں کوئی مسافر آجاتا تو یہ بات ہر کسی کو معلوم تھی کہ یہ شاہ صاحب کے ہاں ٹھہرے گا۔مسجد کا حجرہ اور گھر کی بیٹھک مسافروں کے لیے ہمیشہ قیام گاہ رہتی تھی اور ان کا کھانا پینا پیر صاحب کے ذمے ہوتا تھا۔بچوں کے ساتھ محبت، شفقت اور دوستانہ رویہ ان کا خاصہ تھا۔اور اس محبت کا اظہار اس قدر والہانہ ہوتا تھا کہ دل و دماغ پر نقش ہوجاتا تھا۔ میرے والد مرحوم خود بھی بہت خوش نویس تھے اور میری تعلیم پر اور خصوصاً لکھائی پر بہت محنت کرتے تھے اسکی وجہ سے بہت ابتدائی سالوں میں ہی

میں تختی بہت اچھی طرح لکھ لیتا تھا۔دادا جی کے ہاں جب کوئی ان کا خاص دوست یا مہمان آتا تو مجھے بلا بھیجتے اور فرمائش کرتے کہ تختی لکھ کر لاؤں اور پھر اپنے مہمان کو دکھاتے اور اگر مہمان تعریف کر دیتا تو بہت خوش ہوتے لیکن ان کے اس عمل سے میں ان سے کہیں زیادہ خوش ہو رہا ہوتا اور ہر اگلی دفعہ پہلے سے زیادہ کوشش سے تختی لکھتا۔

میری چھوٹی بہن ان کی خاص لاڈلی تھی گڈی گڈے کا بیاہ رچانا ہمارے بچپن میں لڑکیوں کا پسندیدہ کھیل ہوتا تھا۔ساجدہ (میری چھوٹی بہن) کے بقول ایک دفعہ اس کی گڑیا کی شادی تھی اور وہ بلا دھڑک شادی کی دعوت دینے دادا جی کے پاس پہنچ گئی۔اور وہ بھی بلاتردد شادی میں شریک ہوگئے اور نہ صرف شریک ہوئے بلکہ انہوں نے دکان سے بسکٹ اور کچھ دیگر کھانے پینے کی چیزیں بھی منگوالیں کہ بھئی ہماری پوتی کی گڑیا کی شادی ہے اور شادی میں کھانا پینا تو لازم ہے۔

ایک دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ دادا جی ساجدہ کو روزانہ دس پیسے دیتے ہیں۔ مجھے بہت عجیب محسوس ہوا کیونکہ میں اپنے زعم میں ان کا سب سے زیادہ لاڈلا تھا لیکن جلد ہی مجھے اس کی وجہ معلوم ہوگئی اور وہ یہ تھی کہ ساجدہ روزانہ شام کو دادا جی کے کمرے میں جا کر ان کے پاؤں دابتی، ان کو مٹھیاں بھرتی اور وہ اسے دس پیسے دے دیتے۔ یہ ان کا طریقہ تھا تربیت کا ورنہ ایک پانچ چھ سال کی بچی ان کی کیا خدمت کر سکتی ہوگی اور انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی ان کے بیٹے اور بہویں ایک طرف ان کے عقیدت مند شاگرد اور مقتدی ہر وقت ان کی خدمت اور قدم بوسی کو تیار ہوتے تھے۔اچھی نصیحت اور تربیت کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے اور اس کام کیلئے خدا نے انہیں خاص حکمت اور دانائی عطا کی تھی۔

میرے چچا محترم ایک واقعہ روایت کرتے ہیں کہتے ہیں کہ ایک دن میں گھر کے پاس ایک گلی سے گزر رہا تھا کہ ایک گھر کے دروازے سے ایک خاتون چیختی چلاتی باہر نکلی اور مجھ سے کہنے لگی "بیٹا جلدی کرو میرے گھر کے اندر آؤ کہیں میرا بیٹا اپنے باپ کو مار ہی نہ ڈالے" میں جلدی سے گھر میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیٹے کے ہاتھ میں بیلچہ یا اس قسم کا کوئی اوزار ہے اور بوڑھا باپ جانوروں کی کُھرلی میں گرا ہوا ہے اور بیٹا اپنے باپ کو مار رہا ہے میں نے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور دونوں کے درمیان بمشکل بیچ بچاؤ کروایا۔

خیر دو چار دن بعد والد صاحب (میرے دادا جی) کے سامنے میں نے یہ واقعہ انتہائی کرب اور حیرت کے ساتھ پیش کیا اور عرض کیا کہ ایسا کیسے ممکن ہوا کہ ایک بیٹا اپنے باپ پر اس طرح ہاتھ اٹھائے جبکہ ہم تو آپ کے سامنے نظر اٹھانا بھی خلاف ادب خیال کرتے ہیں فرمانے لگے، بیٹا، گواہ رہنا میں تمہاری عمر کا تھا۔

یہی گلی تھی اور یہی گھر تھا اور گلی میں سے میں گزر رہا تھا اور کسی نے مجھے مدد کے لیے گھر سے آواز دی جب میں اندر داخل ہوا تو اسی طرح کُھرلی میں ایک شخص گرا ہوا تھا اور اس کے بیٹے کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔بس فرق صرف اتنا تھا کہ آج جو کھرلی میں گرا ہوا تھا۔اس وقت اسکے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اور اس کا باپ کھرلی میں پڑا تھا۔بیٹا یہ دنیا مکافات عمل ہے۔والدین کی نافرمانی کی سزا آخرت میں تو جو ملنی ہے سو ملنی ہے اکثر اسی دنیا میں اسکے نتائج انسان دیکھ لیتا ہے اور یہ کوئی بہت حیران کن بات نہیں ہے آپ کے رویے آپ کے اردگرد ایک ماحول ترتیب دے رہے ہوتے ہیں اگر آپ اپنے والدین کے ساتھ احسان اور فرمانبرداری کا رویہ اختیار کریں گے تو آپ کے بچے بھی شعوری اور لاشعوری طور پر وہی سیکھیں گے اور اگر معاملہ الٹ ہوگا تو بچوں کی تربیت بھی ویسے ہی ہوگی۔

دادا جی کی شخصیت میں مجموعی طور پر جو توازن تھا وہ ان کی گفتگو میں بھی موجود رہتا تھا۔ لہجے میں اتار چڑھاؤ بھی کبھی توازن کی حد سے باہر نہیں جاتا تھا۔البتہ ایک نام ایسا تھا جو ان کے لبوں پر آتا تھا تو اکثر ان کی آواز بھرا جاتی تھی اور وہ نام بھی وہ اپنے مخصوص انداز میں لیتے تھے اور وہ ان کے جدامجد کا نام نامی تھا۔وہ اکثر ان کا ذکر اس طرح کرتے "میرے آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ"۔

اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتے تو یوں کہتے "میرے مولا کریما" اور یہ نام لیتے ہوئے ان کے لہجے میں جو رسان، جو محبت اور جو عجز ہوتا تھا۔وہ بیان سے باہر ہے دادا جی خطیب تو ضرور تھے لیکن کوئی پیشہ ور مقرر نہیں تھے جمعہ کا خطبہ ہو یا عیدین کی تقریر انتہائی سادہ لہجے میں اور مقامی زبان میں بات کرتے اور لہجہ کم و بیش دہی ہوتا جو ان کی عمومی گفتگو میں ہوتا لیکن ان کی بات سامعین کے دل و دماغ پر نقش ہوتی جاتی تھی۔عموماً تقریر کی ابتدا اس طرح کرتے۔

"میرے بھائیو، میرے دوستو، میرے سننے والو، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں انسان بنایا۔ دیکھو نا اگر کوئی گدھا، گھوڑا یا بیل بنا دیتا تو کسی کا بوجھ ڈھو رہے ہوتے، کسی کا ہل جوت رہے ہوتے یا کسی کنویں کے رہٹ پر بندھے ہوتے اور چارو ناچار غلامی کا طوق گلے میں ہوتا۔نہ اپنی کوئی مرضی نہ خوشی نہ اپنی مرضی کا کھانا پینا نہ رہنا سہنا۔اور پھر اس بات پر بے شمار تعریف اور شکر ہے مولا کریم کی ذات کا کہ اس نے ہمیں اپنے پیارے نبی آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا امتی بنایا۔ہمیں سیدھی راہ دکھلائی اور سچی ہدایت بخشی۔

اب یہ ایک انتہائی سادہ سی بات ہے لیکن مجھے بہت اچھی طرح سے یاد ہے کہ ایک عید کے خطبے میں انہوں نے بس اتنے سے جملے ہی ادا کیے تھے کہ میری آنکھوں سے ایسے آنسو رواں ہوئے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔اصل بات یہ تھی کہ بظاہر ایک انتہائی سادہ سی بات تھی لیکن دل سے نکل رہی تھی۔ ہر قسم کے تصنع سے پاک تھی لیکن خلوص کے زیور سے مزین تھی اور بات کے پس منظر میں ایک سیرت اور کردار تھا۔سو وہ بات آٹھ دس سال کے بچے کی آنکھوں میں بھی آنسو لا رہی تھی۔

ان کی باتوں سے نہ صرف شکر نعمت کے جذبات ابھرتے تھے بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنے عجز اور اپنی کوتاہی پہ ندامت کا جذبہ بھی عود کر آتا تھا اور سامع خوف و رجا کے اس مقام اور مرحلے پر پہنچ جاتا تھا جو ایمان کا بالکل ٹھیک اور متوازن مقام ہے۔

دادا جی کا علمی لحاظ سے اہل سنت والجماعت کے مکتبہ فکر سے تعلق تھا۔انہیں ہم ایک راسخ العقیدہ مسلمان کہہ سکتے ہیں۔اور یہ مکتبہ فکر انہوں نے نئے سرے سے نہیں اپنایا تھا بلکہ اپنے آباؤ اجداد سے اُن کا یہی مکتبہ فکر چلا آرہا تھا۔اس مکتبۂ فکر کا ایک مخصوص علمی پس منظر ہے اور اختلافی مسائل پر ان کے اپنے دلائل ہیں۔میری ابتدائی تربیت چونکہ انہی کے زیر سایہ ہوئی اسلئے میرا علمی سرمایہ بھی انہی کا مکتبۂ فکر ہی تھا۔لیکن وقت کے ساتھ ساتھ میرا دوسرے مکاتب فکر سے بھی تعلق پیدا ہوا۔اس لئے اختلافی مسائل میں ان کے دلائل سے بھی آگاہی حاصل ہوئی اور اس معاملے میں، میں نے کبھی کسی قسم کی پابندی یا علمی حصار کو

قبول نہیں کیا۔ میں نے اہل تشیع کے دلائل بھی سنے۔ دیوبندی اور اہل حدیث کے مکاتب فکر کو بھی سمجھنے کی کوشش کی اور بلا جھجک اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ بہت سے مقامات پر دوسرے مکاتب فکر کے دلائل کو اپنے دادا جی کے مکتبۂ فکر پر حاوی پایا اور کئی دفعہ مجھے اس بات کا زعم ہونے لگا کہ میں شاید علمی لحاظ سے زیادہ برتر یا مضبوط مقام پر پہنچ گیا ہوں لیکن اس دوران کبھی بھی دادا جی کی محبت یا احترام میں سرمو بھی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ اس میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ علمی دلائل میں چاہے میں نے اپنے آپ کو کتنا ہی برتر یا مضبوط کیوں نہ سمجھ لیا ہو جب سیرت اور کردار میں اپنا تقابل ان سے کیا تو یوں لگا جیسے میں ان کے کف پا کو بھی نہیں چھو پایا۔ زندگی کے مختلف مراحل میں انسان کو جو گوناگوں امتحان درپیش آتے ہیں وہاں پر انسان کی استقامت ہی فیصلہ کن ہوتی ہے اور جب بچپن سے جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمر تک پہنچتے پہنچتے مجھے ان امتحانوں کا سامنا ہوا اور بارہا میرے قدم ڈگمگائے تو مجھے دادا جی کی صراط مستقیم پر استقامت پر بے اختیار رشک ہوا اور میرا علمی برتری کا زعم دھڑام سے زمین پر آ پڑا تب میں نے جانا کہ آپ کا تعلق چاہے کسی بھی مکتبۂ فکر سے ہو اور آپ اپنے آپ کو علمی لحاظ سے کتنا ہی مدلل اور مضبوط تصور کیوں نہ کرتے ہوں آپ کو برتری صرف اور صرف اچھے اور مضبوط سیرت و کردار اور عمل کی بدولت ہی حاصل ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ علم کا سفر جاری رہنا چاہیے اور حق کی تلاش کبھی رکنی نہیں چاہیے۔ لیکن علم کو روبہ عمل بھی ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہر حرف بے معنی اور ہر دلیل لغو ہے۔

خدا کے سچے بندوں کی ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ آج وہ دنیا میں نہیں ہیں اور میں ان کی یاد میں چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ تحریر کر رہا ہوں اور میری یہ کیفیت ہے کہ یہ تحریر شروع کرنے سے پہلے میں نے اپنے آپ کو اس بات پر مجبور پایا کہ ان کے بارے میں قلم اٹھانے سے پہلے اللہ کے حضور دو رکعت ادا کروں اور پھر قلم اٹھاؤں۔ سو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اپنی حیات مبارکہ میں ان کی شخصیت دوسروں پر کس طور پر اثر انداز ہوتی ہوگی۔

اسوہ حسنہ کا ہر ممکن اتباع فقیر محمد علی شاہ کی ذات کا خصوصی وصف تھا۔ شکل و صورت، لباس، چال

ڈھال، بات چیت، عبادت کا طریقہ، لوگوں کے ساتھ رویہ، قصہ مختصر خلوت و جلوت کے ہر لمحے ہر مرحلے میں اپنے جد امجدؐ کے اسوہ حسنہ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا گویا ان کی فطرت میں کندہ کر دیا گیا تھا۔ میری والدہ روایت کرتی ہیں کہ انہیں دادا جی نے بتایا تھا کہ بیٹا میں نے شروع میں حصول رزق حلال کے لیے تمام کام کیے۔ لیکن جلد ہی میں نے دریا پہ پن چکی لگائی اور یہ کام مجھے نسبتاً زیادہ روزگار دینے لگا تو میں نے باقی کام چھوڑ دیئے۔ اور پن چکی میرے خاندان کی کفالت کیلئے کافی ہوگئی۔

دادا جی کو اللہ نے لمبی عمر اور اچھی صحت سے نوازا۔ مرض الموت کے علاوہ میں نے کبھی ان کو زیادہ علیل نہیں دیکھا۔ مستقل لمبے سفر اور وہ بھی پیدل ان کا وطیرہ تھا۔ روزانہ میلوں کے حساب سے پیدل چلتے ارد گرد کے گاؤں دیہات میں بکثرت ان کا آنا جانا رہتا۔ کبھی کسی کے نکاح میں شرکت ہو رہی ہے تو کبھی کسی کے جنازہ میں۔ کبھی کسی بیمار کی عیادت کو جا رہے ہیں تو کبھی کسی کے جھگڑے میں صلح کرانے چل پڑے ہیں۔

یہ غالباً 1985ء کی بات ہے کہ خبر آئی کہ دادا جی علیل ہیں اور علاج کیلئے پشاور تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے چونکہ انہیں ہمیشہ صحت مند اور خوش و خرم دیکھا تھا تو میں نے یہی گمان کیا کہ جلد ہی صحت مند ہو کر واپس آ جائینگے۔ ہماری فیملی کچھ سال قبل ہی میری تعلیم کی غرض سے میرے ننھیالی گاؤں منتقل ہو چکی تھی۔ چند دن بعد کسی نے آ کر بتایا کہ دادا جی نے فرمائش کی ہے کہ اسد (راقم) کو میرے پاس لے کر آؤ۔ سو میرے والد مرحوم مجھے لے کر پشاور پہنچے۔ اس وقت دادا جی ہمارے محترم چچا جان سید قربان حسین شاہ صاحب کے گھر مقیم تھے۔ میں جب ان سے ملا تو بہت خوش ہوئے۔ چہرے پر وہی دائمی نور تھا لیکن خاصی نقاہت محسوس کر رہے تھے۔ میں نے اپنے انداز میں ان کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ آپ جلد ٹھیک ہو جائینگے تو پہلے مسکرائے اور پھر آبدیدہ ہو گئے۔ فرمانے لگے ''یار اسد میں اب چھیاسی برس کا ہو گیا ہوں۔ میرے مولا کریم نے مجھ پر بڑا اکرم اور عنایت کی ہے۔ کوئی حسرت باقی نہیں ہے۔ بس اتنا کافی ہے نا''۔

مجھے گمان نہیں تھا کہ ان کی کہی ہوئی بات سچ ہو جائے گی۔ چند دن بعد اطلاع ملی کہ دادا جی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ آخری لمحوں میں بھی ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور دیکھ بھال کرنے والوں کو ان کی رحلت کا اندازہ اسی بات سے ہوا کہ تسبیح کی حرکت بند ہو گئی تھی۔ ان کی رحلت کی اطلاع کے بعد کے واقعات اگرچہ مجھے بہت صاف اور واضح یاد ہونے چاہیے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا کیونکہ مجھ پر اس وقت عجیب خوابناک سی کیفیت طاری تھی۔ پتہ نہیں کب ہم اپنے ننھیالی گاؤں سے دادا جی کے گاؤں پہنچے۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ دادا جی کی میت صحن میں پڑی تھی اور ارد گرد خاندان اور گاؤں کی خواتین کا جھمگٹا تھا۔ کوئی رو رہی تھیں کوئی ورد کر رہی تھیں یا تلاوت قرآن میں مصروف تھیں۔ میری جب دادا جی پہ نظر پڑی تو میں دھاڑیں مار مار کر ان کی میت سے لپٹ گیا۔ میرا بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ میری رہنما کتاب گم ہو گئی تھی۔

خزانے کا نقشہ کھو گیا تھا۔ میں اب کس سے سوال کروں گا۔ کون میری جستجو کی پیاس بجھائے گا۔ میرے دن کا سورج ڈوب گیا تھا۔ میری رات کا چراغ بجھ چکا تھا۔ غالباً میرے چھوٹے چچا جان نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور باہر لے گئے۔ اس کے بعد کا ہر منظر دھندلا ہو گیا۔ جنازہ جا رہا تھا ایک انبوہ غفیر جنازے کے ساتھ تھا۔ جنازہ ایک کھیت میں سے گزرا جس میں گندم نے ابھی حال ہی میں سر اٹھایا تھا۔ گندم کچلی جا رہی تھی۔ کھیت کے مالک نے بعد میں بتایا کہ اس نے خود فرمائش کی تھی کہ جنازہ میرے کھیت میں سے گزارا جائے اور اسکے بقول کچلی ہوئی گندم پھر سے ہری بھری ہو گئی تھی۔

جنازہ پڑھنے کیلئے لوگ صف آراء ہو گئے۔ امام صاحب جنازے سے پہلے کچھ بیان کر رہے تھے لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ حالانکہ میں پہلی صف میں کھڑا تھا۔ آج سب کچھ بے معنی لگ رہا تھا۔ میں سولہ سترہ سال کی عمر میں اپنے آپ کو یتیم محسوس کر رہا تھا حالانکہ میرے والدین زندہ تھے۔

جنازہ کے بعد میں دادا جی کی چارپائی کے پاس کھڑا تھا۔ ان کی میت ایک تابوت میں رکھی گئی تھی۔ دادا جی آج بھی سفید لباس پہنے ہوئے تھے لیکن جوڑا نیا تھا۔ آخری دیدار کرتے ہوئے ایک بوڑھا پاس سے گزرا اور کہنے لگا۔ ''پیر جی نیا جوڑا مبارک ہو'' بس اسکے بعد مجھے کچھ یاد نہیں۔ جانے آنکھوں میں کیسا چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔ جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

کب تدفین ہوئی، کب ہم جنازہ گاہ سے واپس آئے۔ کب آنسو رکے، کب دل نے قرار پایا، کچھ یاد نہیں۔ آج بھی دادا جی کے گاؤں جاتا ہوں تو اگرچہ کافی کچھ بدل گیا ہے لیکن پھر بھی ایسا لگتا ہے ''جی اُری'' کہیں آس پاس ہی ہیں۔ ان کی خوشبو ہر سو بکھری محسوس ہوتی ہے۔ وہاں کے لوگ آج بھی ان کی نسبت سے بہت پیار، بہت عقیدت سے پیش آتے ہیں۔ ان کی قبر کے پاس جا کر بیٹھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے بستر پر استراحت فرما ہیں اور ان کی چارپائی پر ان کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ ان سے سوال پوچھ رہا ہوں وہ جواب دے رہے ہیں۔ نہ میرا جی ان سے بھرتا ہے نہ وہ مجھ سے اکتاتے ہیں۔ سچ ہے کہ موت ایک حقیقت ہے لیکن خدا کے نیک بندے بھی عجیب ہوتے ہیں ان کی محبت کا احساس زندہ رہتا ہے اور ان کی شفقت کی خوشبو موت کو دغا دے جاتی ہے۔

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات
عام یوں اس کا نہ کر دیتا نظام کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
آہ غافل موت کا راز نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے
عقل جس سے سر بہ زانو ہے وہ مدت ان کی ہے
سرگزشت نوع انسان ایک ساعت ان کی ہے
پھر یہ انساں، آں سوئے افلاک ہے جسکی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر

جو مثالِ شمع روشن محفل قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعت فطرت میں ہے

جس کی نادانی صداقت کیلئے بیتاب ہے
جسکا ناخن ساز ہستی کیلئے مضراب ہے

تخم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشوونما کے واسطے بے تاب ہے

سردی مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں

ہے لحد اس قوت آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند

موت، تجدیدِ مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

خوگر پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں

کہتے ہیں اہل جہاں درد اجل ہے لا دوا
زخم فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام، صبح
مرقد انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

دام سیمین تخیل ہے مرا آفاق گیر
کر لیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر

یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

مختلف ہر منزل ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

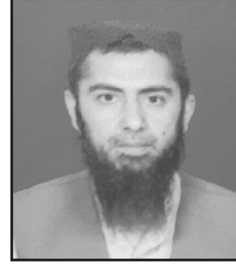
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اقبالؒ

__☆☆____☆☆____☆☆__



بابا جی کی باتیں

سید ارشاد حسین شاہ

برادرم سید قربان حسین شاہ کے فرزند اور پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔ پاکستان آرمی میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر فائز ہیں اور میڈکل کور میں ماہر امراض چشم ہیں۔ انہوں نے اپنی بچپن کی معصومانہ یاداشتوں کو اپنی زبان (Audio) میں ریکارڈ کر کے مجھے بھجوایا اور میں نے انہیں قلمبند کیا۔ تحریر میں اگر کوئی ”بے ادبی“ ملے تو اس کی ذمہ داری میری ہو گی۔ عزیزان ڈاکٹر اسد حسین شاہ اور ڈاکٹر ارشاد حسین شاہ کی تحریر یں پڑھتے ہوئے یاد رہے کہ یہ قبلہ پیر صاحب کی تیسری نسل سے ہیں۔ کاش ہم ان کے ہم عصروں اور دوسری نسل سے بھی کچھ اخذ کروا سکتے ۔ اللہ ہمیں اس کوتاہی پر معاف کرے۔اور نئی نسل کو اپنی علمی میراث کو سنبھالنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مجھے سمجھ نہیں آتی کہ بابا جی کے ساتھ گزرے ہوئے اوقات و واقعات کو کہاں سے شروع کروں۔

بابا جی نے مجھے نماز پڑھنا سکھائی اور خاص کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھانے کا طریقہ مجھے بابا جی نے بتایا۔ وہ مجھے سب کے سامنے نماز با جماعت اور وُضو کرنے کے طریقے بتاتے تھے۔ اس میں ایک حکمت پوشیدہ تھی جب وہ مجھے نماز پڑھنے کے طریقے بتاتے تو تو باقی لوگ غور سے سن رہے ہوتے تھے۔ دراصل بابا جی کا مقصد بھی یہی تھا کہ کچھ عمر رسیدہ لوگ جو شرم کے مارے پوچھ نہیں سکتے تھے وہ بھی سیکھتے رہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ عصر اور مغرب کے دوران اگر کوئی صاحب علم شخص مسجد میں موجود ہوتا تو وہ اُسے امامت کے لیے آگے کر دیتے اور نماز کے بعد تمام نمازیوں کو بٹھا کر نماز با جماعت اور سفرانہ نماز کا طریقہ بتاتے اور اس طرح مسجد کے وضو خانوں اور استنجا خانوں کے طور طریقوں اور آداب سے تمام لوگوں کے سامنے مجھے سکھاتے اور مقصد یہی ہوتا کہ باقی لوگ بھی سیکھتے رہیں۔

امتحان میں پاس ہونے پر وہ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے میں بھی امتحان میں پاس ہونے اور امتیازی نمبر حاصل کرنے کی اطلاع اُن کو خط کے ذریعے دیتا اور جوابی خط میں میرے لیے حوصلہ افزائی کے الفاظ کے ساتھ ساتھ نقد انعامات بھی بھجواتے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے میری کامیابی پر مجھے انعام سے نہ نوازا ہو۔

میر باز خان کے گھر (جہاں اکثر وہ آ کر رہتے تھے) میں اکثر اُن کے پاس جا کر بیٹھتا تھا اور اُن کے پند و نصائح اور علمی باتوں سے مستفید ہوتا تھا۔ گاؤں جاتا تو مجھے اُن کے کتب خانے سے دلچسپی ہوتی تھی ایک الماری میں اُن کی سینکڑوں کتابیں پڑی تھیں میں انہیں شوق سے دیکھتا اور کبھی کبھی نکال کر پڑھنے کی کوشش کرتا۔

بابا جی نے مجھے مخزن اخلاق کے نام سے ایک کتاب دی اور کہا کہ آپ اسے پڑھا کرو یہ آپ کے لیے مناسب ہے جبکہ باقی کتب مشکل ہیں۔ چنانچہ مخزن اخلاق کا نسخہ آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔ ایک دفعہ گاؤں میں میں کسی آدمی کے ساتھ بغیر اطلاع دیئے گھر سے باہر چلا گیا۔ جب میری گمشدگی کا پتہ چلا تو تمام گھر والے پریشان ہو گئے اُس پر پورے گاؤں میں میری تلاش شروع ہو گئی۔ واپس گھر پہنچا تو بابا جی نے مجھے تو کچھ نہیں کہا اور صرف اتنا کہا کہ آئندہ اگر یہ اس طرح کی حرکت کرے تو اس کو سزا دو اسی طرح ایک مرتبہ لنگر سے گکھڑ آتے ہوئے مجھے دیر ہو گئی اور مجھے ڈانٹ کا سخت خطرہ تھا مگر آپ نے اُس وقت بھی مجھے نہیں ڈانٹا اور مجھے نہیں یاد کہ انہوں نے سزا تو درکنار مجھے کبھی ڈانٹا بھی ہو۔ میں باقاعدگی سے اُن کو خط لکھتا تھا جس کے جواب میں خط میں میرے لیے ایک حصہ مخصوص ہوتا جس میں وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوتے اور ہمیشہ تعلیمی معاملات میں میری حوصلہ افزائی کرتے۔ بیماری کے دوران اکثر لوگ اُن سے ملنے آتے۔ خاص طور پر جب بابا جی لنگر سے گکھڑ آتے یا جندر کے راستے آتے تو میں اُن کے ساتھ ہوتا۔ وہ اس دوران مجھے پند و نصائح سے بھی نوازتے، دینی اور شرعی مسائل بھی بتاتے اور اپنی زندگی کے مختلف واقعات کا ذکر بھی کرتے رہتے۔ حضورﷺ کا ذکر بڑی محبت سے کرتے۔ مجھے اُن کی باتوں میں اتنی کشش لگتی کہ میری خواہش ہوتی کہ اس وقت کوئی تیسرا بندہ ہمارے درمیان نہ آئے اور میں اکیلا ہی بابا جی کے ساتھ سفر کرتا رہوں۔

مجھے لگتا تھا کہ باباجی سب سے زیادہ پیار مجھ سے کرتے ہیں، حالانکہ اُن سے ملنے والا ہر شخص یہی سوچتا تھا کہ وہ مجھے سب سے زیادہ عزیز جانتے ہیں۔تو میرا خیال یہ کہ باباجی کی زندگی میں حضورﷺ کی سُنت کا یہ عکس بدرجہ اتم موجود تھا کہ اُن کو ملنے والا ہر شخص اُن کے بارے میں خوش فہمی رکھتا تھا کہ وہ مجھ سے دوسروں سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔

والدین کی اطاعت اور اُن سے محبت (ہمشیرہ کے حوالے سے):

ہمارے والد بزرگوار ہر اچھے اور نیک انسان کی طرح اپنے والدین سے شدید محبت کرتے تھے اُور اُن کی اطاعت میں کوئی دقیقہ فروگزشت نہیں رکھتے تھے۔ ہمارے دادا الحاج سید میاں گل شاہ اپنے خاندان اور علاقے میں واحد شخص تھے جنہوں نے اُس دور میں حرمین الشریفین کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں حج اور سفر کی صعوبتوں کا ادراک آج کے دور میں بہت مشکل ہے مگر ایں سعادت بزور باز ونیست بلانے والے جب بلاتے ہیں تو اطاعت گزار سر کے بل بھی جانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ہمارے والد بھی 15,14 برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔والد بزرگوارم کی اپنے والدین سے محبت کا میں خود گواہ ہوں کہ کئی مرتبہ ہمارے سامنے وہ اپنے والدین کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے اور اُن کی آواز بھرا جاتی۔ ہماری ہمشیرہ شہناز بی بی نے جب اُن کی زندگی کے واقعات کے ورق کھول کر سنانے شروع کیے تو والدین سے اُن کی محبت اور اطاعت کا ذکر بھی آ گیا۔جو خود ہمارے جی صاحب کی زبانی ہے۔فرماتے تھے کہ انہوں نے ابھی جوانی میں قدم رکھا ہی تھا کہ اُنکے والد شدید علیل ہو گئے۔آپ کو بتایا گیا کہ موضع لنگر سے کوسوں دور ایک قصبہ حضرو ضلع (اٹک) میں ایک مُستند ہندو حکیم ہیں جو علاقے میں مانے ہوئے طبیب ہیں اور اُمید تھی کہ اُن کی دوائی سے افاقہ ہوگا۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ اپنے گاؤں میں صبح کی نماز پڑھ کر میں حضرو کے لیے روانہ ہوا اور ظہر کی اذانیں ہو رہی تھیں کہ میں حضرو پہنچ گیا۔سیدھا حکیم صاحب کے پاس پہنچا اور مدعا بیان کیا۔

حکیم صاحب ہندو تھا میری پریشانی بھانپ گیا اور مجھے کہا کہ آپ جاؤ سامنے والی مسجد میں نماز پڑھ کر آ ؤ اور آپ کی دوائی تیار ہو گی۔ میں مسجد میں نماز پڑھ کر حکیم کے پاس واپس آیا تو دوائی تیار تھی۔

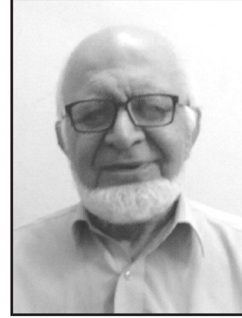
دوائی لی اور واپس گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب گاؤں کے شمالی قبرستان کے قریب پہنچا تو عصر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔آنا فاناً گھر پہنچا تو والد صاحب (ہمارے دادا جان) مجھے دیکھ کر حیران اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بستر پر بیٹھ گئے اور دوائی کھا کر مجھے دعائیں دینے لگے۔

میں نے ایک دفعہ پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ ہمارے والد صاحب دھان پان جسم کے مالک تھے اس کا اندازہ ہمیں اُن کے جسم دبانے سے ہوتا تھا لیکن لباس ایسا پہنتے تھے کہ ایک قوی الحبثہ شخصیت نظر آتے تھے۔ ہر روز 10,8 کلومیٹر کا سفر ضرور کرتے۔ (ہماری زمینیں اور موضع لنگر جہاں ہمارے اور برادارن رہتے تھے، موضع گکھڑ سے 5,4 کلومیٹر کے فاصلے پر تو ضرور ہے اور وہ بھی نیم پہاڑی راستہ مگر آپ کا معمول تھا کہ ہر روز وہاں جاتے باغ (ہمارے کھیت اور زمینیں جنہیں ہم باغ کے نام سے پکارتے تھے) کوئی کام ہوتا تو کر لیتے یا لنگر میں اپنے گھر جاتے، گاؤں کے دوستوں، عقیدت مندوں اور حاجت مندوں سے ملتے اور شام سے پہلے واپس آ جاتے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہمشیرہ ام شہناز بی بی والد صاحب کی زبانی سناتی ہیں کہ آپ ابھی جوان تھے والد بزرگوارم کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا اور والدہ بھی شدید بیمار پڑ گئیں۔اس مرتبہ کسی نے موضع چوہڑ بڑہال (جواب راولپنڈی شہر کا حصہ بن چکا ہے) میں کسی حکیم کا بتایا۔آپ صبح سویرے دوائی کے لیے چل پڑے۔واپسی پر اُسی طرح عصر کے وقت گھر کی ڈیوڑھی پر پہنچے تو والدہ گھر والوں سے پوچھ رہی تھیں کہ بیٹا واپس پہنچا ہے کہ نہیں؟ آپ بلا توقف والدہ کے پاس پہنچے ان کے آگے سر جھکا یا دوائیاں پیش کیں تو والدہ نے کندھوں پر تھپکی دے کر ڈھیروں دعائیں دیں۔

اسی طرح کا ایک واقعہ راقم اطروف نے بزرگوارم سے خود سنا تھا کہ کم عمری میں ہی والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو کچھ عرصہ بعد والدہ بھی بیمار پڑ گئیں۔جب علالت بہت بڑھنے لگی اور اُن کی مایوسی کے سائے گہرے ہونے لگے تو ایک دن بھرائی ہوئی آواز میں والدہ سے پوچھا کیا آپ بھی مجھے اکیلا چھوڑ جائیں گی؟ تو فرمانے لگیں کہ فکر کیوں کرتے ہو، پہلے ایک حاجی جنت میں آپ کے لئے دُعا گو ہے پھر دو ہو جائیں گے۔

__☆☆____☆☆____☆☆__



بابا جی پیر سید محمد علی شاہ

(چند یادیں)

ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ

خاندان سادات پیر سباک کے اسم با مسمیٰ چشم و چراغ ہیں۔ کسی تعارف کے محتاج نہیں مختلف سرکاری ہسپتالوں میں معالج رہے صوبے کی بڑی ہسپتالوں میں ایم۔ ایس اور رجسٹرار رہے اور ڈی۔ ایچ او کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ تاہم ان کی وجہ شہرت ادب اور ادبی خدمات ہیں۔ قریباً چھ کتابوں کے مصنف ہیں جو زیادہ تر تحقیق پر مبنی ہیں۔ پشتو تاریخ، ادب و ثقافت کے ماہر مانے جاتے ہیں تاہم اُردو میں بھی درجنوں مقالے اور کتب تصنیف کر چکے ہیں۔ پیر صاحب مرحوم سے ان کا خاندانی رشتہ تو ہے ہی مگر حیران کن طور پر انہوں نے اپنے بچپن کی یاداشتیں جس طرح مجتمع کر کے پیش کین وہ لائق تحسین ہے۔

سالہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شُود
بُو سعید اندر خراسان و اویس اندر قَرن

وہ عالم باعمل تھے۔ زاہد شب زندہ دار تھے۔ مرشد کامل تھے۔ محرم اسرار و رموز ربانی تھے۔ عارف بے بدل تھے۔ چرخ لامکانی اور طاؤس فضائے لاہوتی تھے۔ لیکن اس خاکسار کے لیے ان سے نسبت ہم نسبی اور قرابت خاص کا رشتہ ہی باعث فخر و افتخار تھا۔ وہ میرے ایک انتہائی قریبی خاندانی بزرگ اور گل سرسبد خاندان شیخ المشائخ حضرت سیدنا پیر سباکؒ تھے۔ مادر و پدر ہر دو سمت سے یکساں نزدیکی قرابت داری تھی۔ والد محترم اور والدہ ماجدہ ان کو ''لالا جی'' کہہ کر مخاطب کرتے۔ مریدین اور معتقدین میں وہ پیر صاحب کے لقب سے معروف تھے۔ بعض خاندانی بزرگ انہیں فقیر صاحب بھی کہتے تھے۔ اور وہ خود

بھی اپنے خطوط میں خود کو فقیر حقیر محمد علی شاہ لکھتے تھے۔ انکی اپنی اولاد ان کو ''جی صاحب'' اور عزیزان نامہربان و بدگمان مثل برادران یوسف انہیں فقط ''حاجی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن ہم خورد سال نسل عزیزوں کے لیے وہ صرف گگھڑ والے بابا جی صاحب تھے۔ نادانی لاپروائی ناقص عقلی اور جذباتی نوخیز عمر کے ماہ و سال کے واقعات کا ایک دھندلا سا خاکہ ذہن میں ہونے کے باعث یہ گنہگار ہیچ مدان لکھاری اپنے عجز کا اقرار کرتا ہے کہ اقلیم سلوک و معرفت کے تاجدار کے روحانی مقام کا صحیح ادراک اس ناکارہ کے بس کی بات نہیں۔ صرف اپنی عابدہ و زاہدہ رابعہ ثانی۔ مریم زمانی والدہ مرحومہ سے سنی ہوئی ایک روایت، روبرو ملاقاتوں، چشم دید واقعات اور ذاتی مشاہدات کو سپرد قلم کرنے پر اکتفا کروں گا۔ اُمید ہے بابا جی کی روح پر فتوح قارئین کرام اور مرحوم کی لائق و فائق اولاد میری غلطیوں اور فروگزاشتوں کو معاف فرمائیں گے۔ میری والدہ محترمہ نے مجھے بتایا۔

''لالا جی کے دو تین خورد سال بچے یکے بعد دیگرے ان کو داغ مفارقت دے گئے۔ اس عالمِ غم و پریشانی واضطراب میں ان کو اپنے خاندانی مرشد قطب عالم سیدنا خواجہ عبدالرحیم باغدرہ شریف نے سنبھالا دیا۔ انہوں نے علوم ظاہری کے درس اور دیگر دنیاوی امور کو تیاگ کر کے فقر و تصوف کا جدی پدری راستہ اختیار کیا۔ اور یہی طریق ان کے واسطے مانند صبر ایوب کمال و وجہہ وصف امتیاز بنا۔ جیسے کہ حبیب خدائے پاک کا ارشاد ہے کہ ''الفقر فخری'' مرشد کامل نے انہیں حاجی بہادر کوہاٹی کے مزار اقدس پر چلہ کاٹنے کا کہا۔ چالیس دن تک ایک چادر اوڑھے قرآن پاک کی تلاوت میں منہمک رہے۔ چالیسویں دن ان کو کسی فرد کے بھاری قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ مراقبے میں مصروف دیگر سالکین کی قطار میں سے گزر کر وہ رجل الغیب ان کے پاس رک گیا۔ اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ بلند آواز میں فرمایا ''حاجی بہادر کے مزار پر بیٹھے حق کے متلاشی تم خود ہی حاجی بہادر ہو۔ تمہیں مبارک ہو''۔ لالا جی صاحب نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ حال یہ تھا کہ پورا جسم خوف اور اشتیاق سے پسینہ پسینہ تھا۔ کسی نے ان کے ہاتھ کو زور سے دبایا اور چل پڑا۔ چند ساعتوں کے بعد لالا جی نے جب آنکھیں اُوپر اُٹھائیں تو کوئی نظر نہیں آیا۔ آپ نے اپنے اردگرد چلہ کشوں سے جب استفادہ کیا تو انہوں نے اپنی مکمل لاعلمی کا

اظہار کیا۔ مرید باصفا چلہ کاٹنے کے بعد جب اپنے پیر مغاں کے دربار میں حاضر ہوئے۔ سارا واقعہ اور اپنا حال بیان کیا۔ انہوں نے بھی آپ کو سلوک و معرفت کا یہ کٹھن مرحلہ بخیر و خوبی طے کرنے پر مبارک دی اور ساتھ ہی تاکید کہ اب جاؤ۔ اپنے ہاں ایک لنگر قائم کرو اور مخلوق خدا کی بے لوث خدمت اور رب ذوالجلال کی طرف صحیح راہنمائی کرو۔

به مے سجاده را رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
که سالک بے خبر نبود زراه رسم منزلها

سالہا بعد جب ایک دن میں نے ان سے اس روحانی و باطنی واقعہ کی اصل حقیقت معلوم کرنے کی جرأت کی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ روہانسی آواز میں فرمایا ''گلہ (عزیز من) اس وقت حال ہی کچھ اور تھا''۔ بعد میں بسط قبض کے احوال بیان کرنے لگے اور اخفائے راز سے کام لیا۔ لیکن عاقل کے لیے اشارہ ہی کافی تھا۔ مرشد عالی مقام نے اس کے بعد دو سلاسل عالیہ طریقت میں خلافت عطا کی۔ 1: نقشبندیہ مجددیہ 2: چشتیہ اُردو روزنامہ نوائے وقت میں شائع ایک مضمون کے مطابق باباجی صاحب باغ درہ سالک آباد شریف کے خلیفہ مجاز ہیں۔ جبکہ چشتیہ میں میرہ شریف کے احمد صاحب سے فیضیاب ہیں (چراغ)۔ اس طرح ایک دن میں نے ان سے دریافت کیا ''باباجی'' آجکل ویسے تو ہمارے خاندان میں کافی افراد کسی نہ کسی سلسلہ عالیہ طریقت میں بیعت ہیں۔ لیکن ان کا تعلق پیر کے ساتھ صرف مرید و معتقد ہی کا ہے۔ ان میں سے خلافت کے منصب پر کوئی خال خال ہی فائز ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ مسکرا کر فرمایا۔ خلافت حاصل کرنے کے لیے کسی مرد کامل باصفا اور صاحب حق کے جوتے سیدھے کرنے پڑتے ہیں۔ اور آج کل کی نسل تن آسان اور برخود غلط انا پرست ہوگئی ہے۔ ورنہ فیض و عطا کے یہ چشمے اب بھی جاری ساری ہیں۔

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

برسوں سے خاندانی بزرگوں کا شیوہ تھا۔ کہ صبح و شام باہر مہمان خانے میں قال اللہ اور قال الرسول کی بابرکت محفلیں جمتی تھیں۔ یادگار سلف پیر طریقت و شریعت سجادہ و عمامہ سید مقبول شاہ مرحوم۔ شیخ الاساتذہ سید الاصفیا والاتقیا۔ منبع زہد و تقویٰ مولانا محبوب شاہ مرحوم۔ پیکر صدق و وفا نانا جان الحاج سید زمان شاہ۔

جامع الفضائل والکمالات صدر مدرس مولانا جمعہ خان۔ سرپرست اعلیٰ مدرسہ ظفر ممہ خیل جامع صفات خان فقیر حاجی مہابت خان صاحب۔ زینت العلماء حق۔ فاضل مدرسہ امینیہ دہلی۔ شاگرد شیخ الاسلام مولانا کفایت اللہ اور فیض یافتہ بدست حق پرست غوث زمان مولانا نصیر الدین غور غشتی، مولانا سید اکبر شاہ پیر سبا کی، نازش علمائے لکی مروت فاضل دیو بند مولانا نجمل جان صاحب، چشمہ جود و سخا و عطا والدم صاحب حاجی الحرمین شریف سیادت پناہ سید حلیم شاہ علیہ رحمۃ۔ قاطع شرک و بدعت، معلم و مبلغ مولانا ولی خان صاحب، عالم حق گو اور مقرر بیباک خان الفقراء مولانا رحمت اللہ خان صاحب مینا خیل لکی مروت، خان الفقراء ملک حاجی ملوک خان، محبان اہل بیت رسول حاجی ممہ خیل صاحب اور انور خان صاحب جانی خیل۔ خطیب محراب و منبر طوطی خوش الحان سیدنا مولانا سید یعقوب شاہ صاحب۔ ٹھیکیدار سرکار، منبع کار ہائے خیر و فلاح حاتم طائی زمان الحاج نوروز خان صاحب اخونزادہ فقیر شیرزہ خان صاحب اور کئی دیگر متنوع الصفات ہستیاں شریک زینت محفل ہوتی تھیں۔

خداوند تعالیٰ معاف فرمائے راقم الحروف بچپن ہی سے منہ پھٹ۔ اپنی عمر کی نسبت اور علمی اوقات سے بڑھ چڑھ کر بولنے والا اور بزرگوں کی عالی ظرفی کا ناجائز فائدہ اٹھا کی ان کی پرنور اور باوقار محفلوں میں بیٹھنے کا شوقین واقع ہوا ہے۔ ایک دن ایک صاحب جو حال ہی میں حج بیت اللہ شریف کی سعادت حاصل کرنے کے بعد واپس لوٹے تھے۔ کہنے لگے کہ مکہ معظّمہ میں جہاں ابوجہل کا گھر تھا۔ آجکل وہاں بیت الخلا ہے اور اس جگہ کو ابوجہل کی ٹٹیاں کہا جاتا ہے۔ باعث صغیر سنی، عقل کی نارسائی میں یہ جسارت کر بیٹھا اور بولا۔ حاجیوں کو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ ابوجہل کافر تھا۔ مشرک تھا۔ لیکن تھا تو حبیب خدا اور سرکار دو جہاں کا ہم قوم۔ سردار اور رشتہ دار اور

''اپنے دشمن کی اہانت ہے کمینوں کا شعار''

حاضرین محفل پر سناٹا چھا گیا۔ اور بعض کے ماتھوں پر بل پڑ گئے۔ لیکن باباجی مسکرائے۔ اور پیر پٹھان حضرت سلیمان تونسوی کا ایک واقعہ بیان فرمایا۔ دربار تونسوی کی مسجد کے ایک امام صاحب ہر شام کی نماز میں سورۃ لہب کی تلاوت ضرور کرتے۔ ایک شام جب حسب معمول مولانا صاحب نے ''تبت یدا ابی لہب وتب'' پڑھی۔ تو یکا یک پیر تونسویؒ جلال میں آئے۔ پیچھے سے امام صاحب کی گردن پر ہاتھ ڈالا۔ اور فرمایا ''اللہ جانے اور اسکا محبوب'' تم کون ہوتے ہو کہ حبیب خدا کے چچا کے بارے میں روز کہتے ہو۔ کہ ابولہب تمھارے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ اس طرح بابا جی نے بالواسطہ میری تائید فرمائی۔ عرصہ بعد ایک حدیث پاک میری نظر سے گزری کہ جنگ بدر کے موقع پر ابولہب کی ایک بیٹی گرفتار ہوئی اور وہ مسلمان ہوگئی لیکن اسلام لانے کے بعد بھی عورتیں ان کو اس آیت شریفہ کے حوالے سے طعنہ دیتی تھیں۔ رشتہ داروں کے حق میں صلہ رحمی کا درس دینے والے نبی برحق کو پتہ چلا تو مزاج اقدس پر گراں گزرا۔ مسجد نبوی تشریف لائے۔ منبر رسول پر جلوہ افروز ہو کر فرمایا ''مسلمانو! تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ میرے رشتہ داروں کے حوالے سے مجھے دکھ دیتے ہو''

مشاہیر امت کے بارے میں رائے:

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ:

اقبال کے بارے میں آپکے ارشادات میرے بہت کام آئے۔ ایک واقعہ یوں ہوا کہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں ہمارے دوست حیران خٹک نے اپنی ایک تصنیف ''اقبال اور دعوت دین'' مجھے عنایت کی اور اس کتاب کے بارے میں میری رائے پوچھی۔ میں نے ان کو صاف بتایا کہ کتاب اچھی ہے لیکن اس میں پیر مہر علی شاہؒ اور میاں شیر محمد شرقپوریؒ سے اقبال کے تعلقات کا ذکر نہیں۔ اور پھر انہیں باباجی سے سنا ہوا ایک قصہ بیان کیا۔ کہ کس طرح سخت پابند شریعت بزرگ جناب شرقپوری اس شخص سے ملتے ہی نہیں تھے جس کے چہرے پر داڑھی نہ ہوتی۔ لیکن اقبال کا نام سنتے ہی وہ ان کے پاس برہنہ پا دوڑ کر آئے

اور فرمایا کہ اس شخص کا باطن ایک خوبصورت داڑھی سے مزین ہے۔ حیران خٹک نے تحریری سند مانگی میں کچھ حواس باختہ ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ تبارک تعالیٰ نے میری لاج رکھ لی۔ باباجی کا روشن چہرہ میرے سامنے آیا۔ اور بائیں طرف اشارہ فرمایا۔ میرے ساتھ ایک اجنبی شخص بیٹھا تھا۔ اس نے گواہی دی کہ وہ شرقپور شہر کا رہنے والا ہے۔ اور اسکے والد صاحب اس واقعے کے عینی گواہ ہیں۔ حیران خٹک اور میں دونوں حیران کہ یا اللہ! یہ شخص کہاں سے آ گیا نہ ہی پہلے اس شخص کا اس اکیڈمی میں آنا جانا تھا۔ اب آپ اس کو اقبال کا اعجاز سمجھیں۔ حضرت خواجہ شرقپوری کا تصوف وفیض کہیں یا باباجی کی کشف وکرامت۔ بعد میں مشہور اقبال شناس: شاکر احمد اعوان صاحب نے بھی اس واقعہ پر مہر تصدیق ثبت کی۔

جناح صاحبؒ:

ایک دن فرمانے لگے کہ محمد علی جناح کے بارے میں اس زمانے کے کئی علمائے دین اور صوفیائے کرام کی طرح میرے دل میں بھی کچھ تحفظات اور اعتراضات تھے۔ اسلامیہ کالج پشاور میں جلسہ تھا۔ اپنے عالی مرتبت مرشد عالی مقام حضور باغدوری صاحب مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ بادل ناخواستہ ان کی تقریر سنی۔ لیکن متاثر نہ ہوا۔ اس موقع پر مشہور پشتو نعت خوان شاعر عاشق رسول مولانا محمد امین صاحب بھی حاضرین محفل کے دل گرماتے اور ایمان تازہ فرماتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد میں اپنے پہلے حج کے لئے ارض مقدس جا رہا تھا۔ حاجی کیمپ مزار قائداعظم کے پاس ہی تھا۔ ایک دن میرے قدم ایک غیبی اشارے پر مزار قائد کی طرف اُٹھ گئے۔ اور وہاں دل کی گہرائیوں سے اس محسن اسلام اور مسلمانانِ ہند کے لیے ڈھیر ساری دعائیں مانگیں۔

باباجی اگرچہ بظاہر سلسلہ عالیہ نقشبندی مجددیہ کے احوال غالب تھے۔ لیکن سہروردیہ اور قادریہ ان کے جدی سلسلے تھے۔ اس طرح وہ سلاسل عالیہ نقشبندیہ مجددیہ۔ چشتیہ۔ سہروردیہ اور قادریہ کے مجمع البحرین تھے۔ میں ان دنوں حضرت امیر حمزہ شنواری چشتی نظامی علیہ الرحمہ کے خیالات سے خاصا متاثر تھا۔ اور انکی کتاب ''وجود و شہود'' میری نظر میں تھی۔ حمزہ صاحب کے ایک خط کے حوالے سے باباجی سے

پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے بڑے طریقے اور ہنر سے کام لے کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت کرام کی توہین کی ہے اور ان کا مرتبہ شیخان عظام رضوان اللہ علیہم اور صحابہ کرام سے کافی نیچے کر کے بیان فرمایا ہے؟ باباجی کچھ دیر خاموش رہے۔ چند ساعت بعد فرمایا۔ عزیزم! مجدد الف ثانیؒ نے تین درجات بیان فرمائے ہیں۔(1) نبوت (2) امامت / خلافت (3) ولایت۔ اعلیٰ ترین مقام نبوت پر انبیائے کرام فائز ہیں۔ امامت شیخان عظام رضوان اللہ علیہم کے حصے میں آئی اور امام الاولیاء شیر خدا علی المرتضٰی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ اور یہ جان لو کہ تینوں امام / خلفاء بھی اولیائے کرام کے صف اول میں شامل ہیں اور پھر یہ شعر پڑھا۔

چراغ مسجد محراب و منبر
ابوبکر و عمر، عثمان و حیدر

اس طرح ایک دفعہ میں یہ پوچھنے کی گستاخی کر بیٹھا'' باباجی۔ خاکم بدہن یہ شعر امام ربانی علیہ رحمۃ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

پنجۂ خود در پنجۂ خدا دارم
من چہ پروائے مصطفٰے دارم

باباجی کے چہرہ انور پر چند لحظوں کے لیے سرخی چھا گئی۔ فرمایا یہ سچ ہے کہ صوفیائے عظام کے منہ سے عالم جذب وسکر میں ایسے کلمات نکلے ہیں۔ جنہیں ہم آج سطحیات کے درجے میں رکھتے ہیں لیکن میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے بارے میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ شعر ان کے انتہائی حساس شرعی مزاج سے بالکل ہی مطابقت نہیں رکھتا۔ بعد میں جب میں نے مکتوبات شریف پڑھے تو مجدد صاحب کے شرعی اخلاص نیک نیتی اور روحانی دنیا میں ان کے انتہائی بلند مقام کا دل سے معتقد ہوا۔ بعد میں پتہ چلا کہ مذکورہ بالا شعر ایک مجذوب الحال قادری بزرگ کا ہے۔

لالا عبدالرحیم نیازی کے ساتھ ایک ملاقات:

لالا عبدالرحیم نیازی اسلامیہ کالج پشاور کے قیام (1913) فلسفہ اور منطق کے اُستاد تھے۔ بعد میں گورنمنٹ کالج بنوں کے پرنسپل بن گئے۔ عقل سے حقیقت کل تک رسائی ناممکن تھی۔ اس لیے وجدان کو عقل پر ترجیح دی۔ فلسفے کو چھوڑ کر فارسی کی صوفیانہ شاعری پڑھانی شروع کر دی۔ لیکچر کے دوران مالک حقیقی کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے۔ آخر کار فضل خداوندی سے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے اویسی طریقے سے فیض پایا۔ وائس چانسلر چوہدری محمد علی صاحب ان کے اولین شاگردوں میں سے تھے۔ قابل فخر شاگرد نے نسل نو کی روحانی اور اخلاقی تربیت کی خاطر انہیں یونیورسٹی کیمپس پر اعزازی پروفیسر کا درجہ دے کر رہائش فراہم کر دی۔ حق کے متلاشی اُستاد، شاگرد عالم و فاضل، فقراء و صلحاء آتے اور بقدر ظرف و استعداد اپنا حصہ پاتے۔ ایک دن مریز خان ٹھیکیدار باباجی کو بھی ساتھ لے گئے۔ کہتے ہیں کہ ''ولی را ولی مے شناسد''۔ دونوں بزرگوں نے تعظیماً ذرا جھک کر مصافحہ کیا۔ لالا صاحب نے مولانا رومؒ کا ایک شعر پڑھا۔ باباجی نے شیخ سعدی کے ایک شعر میں اس کا جواب دیا (افسوس یہ نالائق وہ اشعار نوٹ نہ کر سکا)۔ دونوں اطراف سے اشاروں کنائیوں میں بہت کچھ کہا گیا۔ راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ حاجی مریز خان اور یہ گنہگار ہونقوں کی طرح صرف چہروں کو دیکھتے رہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ یہ فقط ایک تعارفی تقریب تھی۔ ایک نے پوچھا ''تو منور از جمال کیستی ؟'' تو دوسرے کا سوال تھا کہ ''تو مکمل از کمال کیستی ؟'' لالا صاحب شک وشبہات کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتے، گمان و قیاس کے پردے چاک کرتے اور فلسفے منطق کی گتھیاں سلجھا کر جس مقام کمال تک پہنچے تھے۔ باباجی صاحب شریعت و طریقت اور معرفت کے محفوظ راستے سے گزر کر اس منزل جمال کو پا چکے تھے۔ یوں یہ ملاقات گویا بمثل ابن رشد اور ابن عربی کا آمنا سامنا تھا۔ جس پر مجدد الف ثانی کی تجلیات کی پرچھائیاں برس رہی تھیں۔ سال دو بعد جب لالا صاحب واصل بحق ہوئے۔ اور یہ خبر میں نے باباجی کو بتائی تو دونوں ہاتھ اٹھا کر لالا صاحب کی مغفرت اور درگاہ خداوندی میں ان کے درجات بلند کے لیے بصد عجز و نیاز دعا مانگی۔

دنیاوی فہم وفراست:

ایک بار باباجیؒ فیلڈ مارشل ایوب خان کے دورِحکومت میں عوام اور معتقدین کے بے حد اصرار پر بی۔ڈی ممبر منتخب ہوگئے۔صدر ایوب خان کسانوں کے ایک کنونشن میں شرکت کے سلسلے میں اٹک آئے۔ باباجی نے کسانوں اور کاشتکاروں کی بہبود و بھلائی کے سلسلے میں ان کے سامنے ایسے اہم نکات پیش کیے کہ صدرِ مملکت ان کے فہم وفراست اور کسانوں اور مالکان اراضی کے درمیان اچھے اور بہتر تعلقات قائم کرنے اور دونوں کے حقوق اور فرائض وضع کرنے کے فارمولے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔اسکے بعد ایک بھرے جلسے میں صدر ایوب خان نے علاقہ نالہ نندنا کے اس فقیر کی دانش کی برملا تعریف کی۔ان کے ایسے ہی مثبت کردار کی وجہ سے علاقے کے عوام وخوانین دونوں ان کے فیصلوں کو عزت وتکریم کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان پرعمل پیرا ہوتے۔

اندرونِ حرم پاک کی سعادت:

اللہ تعالیٰ! نے باباجی کو ایک نورانی چہرے کے ساتھ ایک دلنواز شخصیت سے بھی نوازا تھا۔اہل عرب بھی ان کی جمالی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔پہلی بار جب حرم پاک میں حاضری دی۔ تو اس وقت حرم شریف کو عطر گلاب کا غسل دے کر غلاف کعبہ تبدیل کیا جا رہا تھا۔آپ کے دل میں بھی بیت اللہ شریف کو اندر سے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔مسبب الاسباب نے اسی وقت یہ موقع فراہم کر دیا۔ خادمین کعبہ نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے پاس بلایا۔سہارا دے کر اوپر اٹھالیا۔اس طرح آپ کو خانہ خدا کے اندر چاروں گوشوں میں نوافل پڑھنے اور رحمت بخشش ومعرفت کی دعائیں مانگنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

باباجی کا وعدہ:

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تھی۔ان دنوں میں اپنے جدامجد قطب الاقطاب غوث زماں حضرت پیر سباکؒ کے بارے میں ایک تحقیقی کتاب لکھنے کا سوچ رہا تھا۔باباجی سے مشورہ مانگا۔بے حد

خوش ہوئے کامیابی کی دعا فرمائی اور ہر قسم کی علمی اور مالی معاونت کا وعدہ فرمایا۔اپنے والد مرحوم میاں گل شاہ بن سید امیر شاہ کا صدی پہلے دستی تحریر کردہ ایک شجرہ جو میرے پاس پہلے سے موجود دیگر خاندانی شجروں سے زیادہ معلوماتی اور تفصیلی تھا مجھے عنایت فرمایا۔ایسے ہی ایک خط میں میرے چند تحفظات و اعتراضات کو دور فرمایا۔افسوس وہ جلد ہی عالم بقا کی طرف رخصت ہوگئے۔البتہ ان کے ایک سخن فہم، مصنف ومئولف بیٹے سید مشتاق حُسین شاہ نے اس کتاب کی چھپائی کے ہر مرحلے میں میری مدد کی۔(جزاک اللہ فی الدارین خیراً)

علوم ظاہری کے حصول کے بعد ابتدائی سالوں میں آپ کی طبیعت میں جلالی کیفیت پائی جاتی تھی۔اور شرعی حدود سے ذرا سا تجاوز بھی کسی میں دیکھتے تو اس پر برہم ہو جاتے۔دوسری جنگ عظیم میں ایک جوان مارا گیا۔جوان کلین شیو اور سر کے بال فوجی کٹ تھے۔آپ نے اس کا جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا۔گاؤں اور علاقے کے نوجوان ان کے سامنے برہنہ سر گزرنے سے گریز کرتے۔بعد میں طریقت ومعرفت میں مزید عروج روحانی کے ساتھ ساتھ طبیعت پر اسوہ رسول عربیﷺ مشفقانہ رنگ چڑھتا گیا۔کردار، اخلاق اور حلیمانہ گفتگو سے مخلوق خدا کی اصلاح اور رہنمائی کرتے۔خود تو ذاتی زندگی میں انتہائی پاکباز اور پابند شریعت بزرگ تھے۔لیکن دوسروں کی زندگی سدھارنے کے لیے نرمی، حلم اور خوش گفتاری سے کام لیتے۔علمائے صالحین اور اولیائے عظام کی روزمرہ مخزن اخلاق زندگی سے مثالیں دیتے۔گناہ سے نفرت اور گنہگار کو سینے سے لگانے کا درس دیتے۔طالب وجویا قول احسن کی بدولت راہ راست کی طرف گامزن ہو جاتا۔

شکرانۂ نعمت:

ایک رات سرور جان خان مرحوم سابقہ چیف انجینیر اور سیکرٹری پی۔ڈبلیو۔ڈی (سابق صدر پاکستان غلام اسحاق خان کے سسر) کے پرآسائش مہمان خانے میں آرام فرما رہے تھے۔لیکن آرام کہاں اہل خانہ نے دیکھا کہ کمرے کی بتی ساری رات جلتی رہی اور مہمان مصلیٰ، بچھا کر یاد خداوندی میں مصروف

تھے۔صبح کسی نے اتنی ریاضت وعبادت کی وجہ پوچھی تو فرمایا ’’جس ذات پاک نے مجھے رات اتنی نعمتوں اور سہولتوں سے نوازا۔اسے میں غفلت میں کیسے گزار دیتا اور اس صاحب کرم وفضل وعطا کا شکر کیوں ادا نہ کرتا‘‘؟

حس مزاح:

بابا جی ایک لطیف اور شائستہ حس مزاح کے مالک تھے۔ جب پہلی بار ان کا واسطہ اپنے مروت پشتون مریدوں سے پڑا۔تو چند دن بعد ایک بے تکلف بزرگ نے ان سے حال پوچھا۔تو بابا جی نے مسکرا کر فرمایا۔’’عجب بے تکلف اور بے باک قوم ہے۔محفل میں ہر فرد مجھ سے کہتا ہے جی دلتہ کنہ ولگوہ‘‘ اب اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے؟ اب اس پشتو محاورے کا سیدھا سادہ لغوی مطلب یہ ہے۔کہ حضرت یہاں تشریف رکھیے۔ چونکہ پشتو زبان کے محاوروں میں ایک فطری سادگی،شوخی اور بیبا کی پائی جاتی ہے۔اور لکھنوی درباری،خوشامدانہ اور بناوٹی انداز مفقود ہے۔اس محاورے کے لفظی معنی یہ ہیں کہ حضرت مقعد کے بل بیٹھ جائیے۔اس بارے میں مجھے مشہور سیاسی لیڈر ڈاکٹر خان صاحب کا اسی قسم کا ایک لطیفہ یاد آرہا ہے لیکن مضمون کی طوالت کے ڈر سے اسے لکھنے سے قاصر ہوں۔تاہم مشہور پشتو شاعر غنی خان کا اس موضوع پر یہ شعر حاضر ہے۔(اتفاق سے غنی خان ڈاکٹر خان صاحب کے سگے بھتیجے تھے)

والله چہ جنت نہ بہ شم راستون
چہ پہ کے نہ وارم کنزلہ د پختون

(ترجمہ) خدا کی قسم جنت سے بھی پلٹ آؤنگا،نہ سنی جو وہاں پشتون کی دشنام طرازیاں

ایک بار موضع خواجہ خیل کے ایک حجرے میں تشریف فرما تھے۔کسی غرض سے باہر تشریف لے گئے لیکن جلد ہی لوٹ آئے۔حاضرین محفل نے وجہ پوچھی تو فرمایا۔باہر ایک نوجوان اپنی نئی خریدی بندوق کندھے پر اٹھائے آرہا تھا۔ایک دوست نے طعنہ دیا کہ نشانہ تمھارا صحیح نہیں ہے کیا ہوا کہ بندوق نئی خریدی ہے۔میں تمھارے سامنے کھڑا ہوں آزماتے ہیں کہ تمھارا نشانہ کیسا ہے؟ اب پہلے والے حضرت نشانہ لے رہے ہیں اور اسکا دوست اچھل کود کر کے اس کے نشانے سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے۔دل میں

خیال آگزرا۔کہیں اس نوجوان کو یہ بات سوجھ نہ جائے کہ یہ پیر بنا پھرتا ہے۔چلو اس حضرت پر یہ مشق کر کے دیکھتے ہیں کہ گولی سے بچنے کے لیے کسی کرامت کا مالک ہے یا نہیں؟

مہدی شاہ باباؒ حضرت کے رشتہ دار اور ایک فقیر منش بزرگ تھے۔ان کے دو فرزند مستند عالم دین اور شیخ الحدیث تھے۔ایک فقہی مسئلے کے بارے میں دونوں بزرگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔معاملے نے طول پکڑا اور بات ان بن اور ذاتی رنجش میں بدل گئی۔ایک دن میں نے پوچھا۔’’بابا جی مہدی شاہ صاحب آپ کے قریبی عزیز اور ہم عمر بھی ہیں۔یاد کریں کبھی انکی ذات نے آپ پر کوئی احسان بھی کیا ہے؟ فرمایا’’ہاں طالب علمی کے زمانے میں ایک بار میں ایک دوسرے گاؤں کے اُستاد سے درس لے کر واپس گھر آرہا تھا۔ مجھے ’ہرنیا‘ (فتق) کی تکلیف تھی۔مہدی شاہ کچھ اور بچوں کے ساتھ کپڑے سے بنے ہوئے ایک سخت گیند سے کھیل رہا تھا۔میں نے خوشی کے اظہار کے طور پر اس کا نام پکارا۔مہدی شاہ نے آؤ دیکھا،نہ تاؤ،سخت گیند تاک کر مجھے ماردی۔اتفاقاً گیند سیدھی میرے جسم سے نکلی ہوئی ہرنیا پر پڑی۔چند لحظوں کی تکلیف کی وجہ سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم یوں ہوا کہ ہرنیا ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔

ایک دن میں نے ان سے پوچھا۔بابا جی آپ نے اچھی خاصی ظاہری اور باطنی تعلیم حاصل کی۔کیا اس علم نے آپ کو اس دنیا میں کوئی فائدہ بھی پہنچایا ہے۔مسکرائے اور فرمایا کہ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کیمبل پور (اٹک) اور پشاور کے درمیان دن ڈھلنے کیساتھ ریل گاڑی کی آمد ورفت اٹک پل بند ہو جانے کے باعث رک جاتی تھی۔مسافروں کو پیدل پل عبور کرنا پڑتا تھا۔ایک دفعہ سخت گرمیوں کا موسم تھا۔میں اپنے ماموں مرحوم فضل شاہ صاحب کے ہمراہ اٹک پل کے پرلے کنارے پر اُتر گیا۔انتہائی پیاس سے زبانیں سوکھ چکی تھی۔اس دوران ایک ایف سی کا سپاہی ہاتھ میں خط پکڑے بدحواس ایک ایک مسافر کے پاس جارہا تھا تاکہ کوئی پڑھا لکھا شخص اسے خط کی عبارت سنا دے۔ان دنوں پڑھے لکھے فرد شاذونادر ہی ملتے تھے۔سپاہی اس بھاگم دوڑ کے عالم میں ہمارے پاس بھی آیا۔ماموں سے پوچھا آپ میں سے کوئی پڑھا لکھا فرد ہے؟ ماموں نے جھٹ سر ہلایا۔ لیکن پہلے ایک جام پانی کا

تقاضا کیا تاکہ گلا اور زبان تر ہو جائے۔ سپاہی خوش ہو کر بولا۔ ایک منٹ میں پانی لایا۔ کچھ دیر بعد بیچارہ پہاڑی کی چوٹی پر سے پانی سے بھرا ایک گھڑا سر پر اُٹھا کر لایا۔ ماموں نے خط میرے حوالے کیا۔ میں نے پہلے ایک بھری گڑوی ٹھنڈا پانی ماموں کو پلایا اور اس کے بعد خود پیا۔ بعد میں وہ خط سپاہی کو پشتو ترجمہ کے ساتھ پڑھ کر سنایا۔

میں نے اپنے علم کے عوض زندگی میں بس یہ ایک جام ٹھنڈے پانی کا فائدہ اُٹھایا۔ اور اب آخرت میں حوض کوثر کے کنارے شافع محشر کے ہاتھوں جام کوثر پینے کی آرزو ہے اور رو پڑے۔

باباجی کی وفات کے بعد جب ہم ان کے جنازے کے ساتھ قبرستان جا رہے تھے۔ تو راستے میں ہمارے خاندان کی ایک عظیم دانشور، بزرگ ہستی اور نامور انگریزی، اُردو اور فارسی مصنف، مئولف اور مترجم سید محمد ایوب بخاری ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان نے اس عظیم خاندانی سانحے کے بارے میں میرے تاثرات پوچھے۔ تو میری زبان سے بے ساختہ بصد افسوس یہ الفاظ نکلے ''چاچا جی! آج ہمارے خاندان سے معرفت اور فقر رخصت ہو گیا۔''

ترکش مارا خدنگ آخرین' اناللہ وانا الیہ راجعون۔

التجائے مصنف:

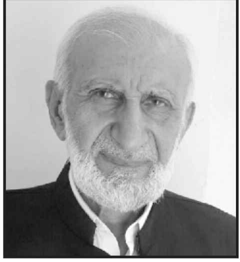
رب دو جہاں اس ذکر صالحین و عابدین کے صدقے اور طفیل راقم الحروف اس کے والدین، دیگر آباؤ اجداد، آل اولاد، بھائی بہنوں، عزیز و اقارب، تمام مسلمانان عالم اور اس مضمون کے قارئین کرام کو شافع محشر اور ساقی کوثر کے دست اقدس سے آب کوثر کے بھرے جام عطاء کرے۔

__☆☆____☆☆____☆☆__

رَہ نوردِ شوق

سابق ڈائریکٹر جنرل محکمہ ڈاکخانہ جات (اسلام آباد)

سید الطاف حسین شاہ



الطاف حسین شاہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت، حسن اخلاق اور صورت و سیرت کے جملہ خصائص سے نوازا ہے۔ بچپن اور طالب علمی کے زمانے سے ہی اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ اسلامیہ کالج پشاور کی شہرہ آفاق ''خیبر یونین'' کے صدر اور اسی کالج کے مشہور مجلہ ''خیبر'' کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔ کچھ عرصہ کوہاٹ کیڈٹ کالج میں تدریس کے بعد سی۔ ایس۔ ایس کا امتحان پاس کر کے باقاعدہ طور پر محکمہ ڈاکخانہ جات کے ساتھ منسلک ہو گئے اور سپر نٹنڈنٹ کے عہدے سے آغاز کر کے محکمہ ڈاکخانہ جات کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچ کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے بھی کئی کتب لکھیں۔ جن میں ''حدیثِ نامہ بر'' جیسی ضخیم کتاب بھی ہے جو ان کی زمانہ طالب علمی اور ملازمت کی خوشگوار اور معلومات سے پرُ یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ مرحوم پیر صاحب سے ان کا قریبی خاندانی رشتہ ہے۔ اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے آج بھی ان کا نام اپنے محکمے اور خاندان میں بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔

سید میاں گل صاحب کے ہاں ایک جھلملاتی پیشانی والے حسین و جمیل فرزند کی ولادت ہوئی تو اسی لمحے ان کے دل میں یہ خواہش جاگزیں ہوئی کہ یہ نومولود اپنے پاکباز اسلاف باصفا کی طرح نیک سیرت ہو اور مرد حق بھی۔ اپنے مورث اعلیٰ حضرت محمود شاہ پیر سباک علیہ رحمۃ کے اہل خاندان کے ناموں پر نظر ڈالی اور حضرت موصوف کے پڑپوتے گنج علوم حضرت محمد علی شاہ علیہ الرحمۃ کا نام نامی اپنے

بچے کے لیے پسند فرمالیا۔اس خاندان میں یہ نام تیسری بار رکھا جارہا تھا اور اس کے فیوض و برکات میں کسی کو کلام نہیں تھا۔محمد علی شاہ اپنے والد محترم کی اُنگلی پکڑنے کے قابل ہوئے تو انہیں قرآنی قاعدہ ہاتھ میں تھما دیا گیا۔رب ذوالجلال کا کلام مبارک پڑھنے کے قابل ہوئے تو ذہین وفطین فرزند کو قرآنی الفاظ کو سمجھنے کی فکر لاحق ہوگئی۔اور اسی روز سے مختلف اساتذہ او علماء دین کی محفلوں میں شریک ہونے لگے۔لیکن رائج الوقت علوم تو محض ان کی ذہن کی آبیاری کر سکے اور اس میدان کے شہسوار تو وہ بن ہی گئے۔جوانی کے اولین ایام ہی میں فقہ اور منطق کے خزانوں کو اپنے دسترس میں لے آئے اور اڑوس پڑوس کے دیگر علماء سے بحث مباحث اور مناظروں میں حصہ لینے لگے۔اپنے فطری استعداد اور حاصل کردہ علمی پونجی کے بل بوتے پر انہوں نے ہر معرکہ بڑے حوصلے سے سر کیا۔

لیکن اپنے روحانی تسکین کے لیے انہیں علم سے زیادہ مجاھدہ قلبی کی ضرورت تھی۔سو اپنی دستار فضلیت اتار کر انہوں نے نفس کشی کو اپنا وسیلہ بنا دیا۔خانقاہوں کی خاک چھانی، بزرگوں کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے، چلے کاٹے اور نفس امارہ کی سرکوبی کی۔حضرت حاجی بہادر صاحب کوہاٹی رحمت اللہ علیہ کے مزار اقدس پر اپنے یادگار چلے کا ذکر وہ اکثر کیا کرتے تھے جہاں پر ہر نوع کی صعوبتوں کو انہوں نے اپنی منزل تک رسائی کے لیے محض نشان راہ تصور کیا۔اور پھر حضرت خواجہ باغدری کو اپنا پیر طریقت منتخب فرمایا۔نفس کشی اور دل سوزی کے اس سفر میں وہ پیر محمد علی شاہ سے فقیر محمد علی شاہ بن گئے۔اپنے مرشد کامل سے خلعت خلافت پائی اور مخلوق خدا کے تزکیہ نفس کے مقدس فریضہ میں مشغول ہوگئے۔

1950ء میں وہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے جہاں مکہ معظّمہ کے سنگلاخ پہاڑوں کے دامن میں ذکر الٰہی کے شوق کو جاری رکھنے کی خاطر سنت محبوب الٰہی کے اتباع میں غار حرا کو اپنا مسکن بنایا۔اور محض تیسرے روز اپنی مادی ضروریات کی خاطر شہر مکہ اتر آنے پر اکتفا فرماتے۔ریاضت کی ان کٹھن راہوں نے انہیں سخت جان تو ضرور بنا دیا لیکن پیار و محبت کے خزانوں سے قطعاً محروم ہونے نہیں دیا۔فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں جب بنیادی جمہوریتوں کا نظام متعارف ہوا تو اپنے گاؤں کے

باسیوں نے انہیں اپنی نمائندگی کے اعزاز سے نوازا۔اور پھر ہمارے اور آپ کے ممدوح پیر صاحب علیہ الرحمۃ نے یہ منصب بھی بڑی فراست اور معاملہ فہمی کے ساتھ نبھایا۔آج اگران کا گاؤں فکر و نظر میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور بنیادی سہولیات کی فراہمی کے سلسلے میں ایک ماڈل ویلیج کا منظر پیش کرتا ہے تو اس میں پیر صاحب کی عرق ریزی سے پیدا ہونے والے مصالحانہ ماحول کا بڑا ہاتھ ہے۔حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ان کے پاکیزہ کردار اور محبت بھری گفتگو کے معتقد صرف ان کے اڑوس پڑوس والے لوگ نہیں تھے۔ان کے مریدوں اور ان سے روحانی فیض حاصل کرنے والے تو پشاور، نوشہرہ، بنوں اور لکی مروت کے اضلاع تک میں دیکھے جاسکتے ہیں۔وہ ایک طرف سے اچھے اور منجھے ہوئے تیراک تھے،تو دوسری طرف پہاڑی راستوں اور ریگستانی زمین پر چلنے والے ماہر راہ نورد شوق بھی تھے۔اپنے دوستوں سے یاری نبھانے والے تھے۔اور اس راہ میں آنیوالی ہر رکاوٹ کو عبور کرنے کا فن وہ خوب جانتے تھے۔غرض پیر صاحب مرحوم و مغفور کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ علامہ اقبال کے مرد مومن ''نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو'' کے معیار پر ہر حال میں پورے اترتے تھے تو بے جا نہ ہوگا۔

آج بھی جب کوئی ان کا نام لیتا ہے تو راقم الحروف کی نظروں میں فوراً وہ منظر آجاتا ہے جب ان کے دم آخرین سے کچھ عرصہ قبل مجھے انکی رفیقہء حیات کی فاتحہ کے سلسلے میں ان کے گاؤں جانا پڑا۔میں وہاں پہنچا تو جمعہ کی نماز کے لیے لوگ مسجد میں جمع تھے۔میں نے بھی آخری صفوں میں اپنے لیے جگہ بنالی۔پیر صاحب خطبے کے لئے اٹھنے لگے تو ان کی نگاہ دوررس نے اس عاجز کو پالیا۔پھر کیا ہوا کہ اس پیرانہ سالی میں بھی اپنے ایک نوجوان مہمان کی پذیرائی کے لئے وہ صفوں کو چیرتے ہوئے میرے پاس آپہنچے اور مجھے وہاں سے کھینچ کر آگے لے گئے۔

یہ وضعداری کسی خاص انسان یا طبقے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ اس معاملہ میں وہ بڑے فیاض واقع ہوئے تھے۔ہمارے گاؤں میں انکے ایک عقیدت مند تھے جنہیں سارا ہی گاؤں ''اندر'' کے نام سے پکارتا تھا۔وجہ جو بھی ہو یہ ان حضرت کا تکیہ کلام یا یوں سمجھئے طرز ادا تھا۔اپنی ہر گفتگو کا آغاز یوں فرماتے گویا وہ یہ انکشاف محض اپنے سامع کی خاطر اس اُمید کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ آپ اس کے اندر

کی بات سمجھ کر اپنے پلے باندھ رکھیں گے۔ پیر صاحب اس سے ہمکلام ہوتے تو اسے اسکے پیدائشی نام سے انور بلکہ انور خان پکارتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں تو پیر صاحب کے توسط سے ہی یہ آ گاہی ہوئی کہ اندر دراصل انور ہے۔ اپنا اصل نام سن کر تو گویا اس کی باچھیں کھل جاتیں اور پھر جب تک گاؤں میں پیر صاحب موجود ہوتے وہ حضرت ان کے نام کی مالا جپتے۔ ایک دن کسی نے فقیر صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ آخر وہ اندر کو انور کیوں پکارتے ہیں؟ فرمانے لگے ''یہ جتنا اندر ہے اتنا ہی باہر بھی ہے'' بذلہ سنجی کا یہ انداز پیر صاحب کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ لطیف اور دلنشین انداز کے چٹکلے سنا کر ہی تو وہ مشکل اور متنازع معاملات کا حل پیش کرنے کا گُر جانتے تھے۔ اور ایسے طرز کلام کی بدولت ہی وہ ہر طبقہ فکر و معاش میں مقبول تھے۔ ان کے عقیدت مندوں اور حلقہ احباب میں ایک طرف سیدھے سادے دیہاتی بہ تعداد کثیر شامل تھے تو ساتھ ہی دانشوروں اور اہل ثروت بزرگوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ سب ہی مخلوق خدا اپنے دکھوں اور درمانوں کا مداوا چاہتے اور اس سلسلے میں انہیں اپنا ہمراز اور غمگسار سمجھتے اور پیر صاحب بھی ان کی توقعات پر پورا اترنے میں کوشاں نظر آتے اور اپنے پرخلوص مشورہ سے نوازتے۔ رب ذوالجلال کے حضور اس کے حق میں دعا فرماتے اور حق وسائل کی فرمائش پر اس پر دم فرماتے یا تعویذ لکھ کر دے دیتے۔
فقیر صاحب کے روحانی مراتب کے چرچے تو اہلیان لکی مروت میں اس دن سے ہونے لگے جب علاقہ ''ایاز والا'' میں فیروز خان خواجہ خیل کی خشک اراضی کے لیے ان کی نشاندہی پر ایک مقام کھدائی سے پانی نکل آیا۔ اگرچہ خود فقیر صاحب اس کو روحانی کرشمہ کہنے کی بجائے محض نگاہ کی دور بینی بتاتے تھے۔ لیکن وہی بات کہ ''این سعادت بزور بازو نیست'' ویسے بھی ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ ان کے عقیدت مند انہیں بالکل اپنے جیسا عام انسان سمجھیں۔ اور ان سے ایسی باتوں کی توقع نہ رکھیں جن کا انہوں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ ایک دفعہ دوران سفر ان کی نظر آبادی سے دور واقع ایک ایسے ریلوے پھاٹک پر پڑی جس کے ساتھ ہی پھاٹک کھولنے والے ریلوے ملازم کے لیے ایک کمرے کی رہائش گاہ موجود تھی۔ دن میں محض دو چار مرتبہ گزرنے والی گاڑیوں کے لیے پھاٹک کھولنے کے علاوہ اس ملازم کا اور کوئی شغل تھا۔ تو یہ کہ اپنے حقیقی مالک سے لو لگائے اس ان داتا کے تصور کا تانا بانا بنتا رہتا تھا۔ فقیر صاحب اس منظر سے

اتنے متاثر تھے کہ ایسی مجرد زندگی کو انہوں نے اپنا آئیڈیل قرار دیا۔ میری کبھی ان سے ملاقات ہوتی تو اس ویرانی اور پھاٹک والے کے عظیم مشغلے کا ضرور ذکر کرتے اور فرماتے ''کاش آپ میرے لیے کوئی ایسی نوکری ڈھونڈھ سکیں''۔ اگرچہ یہ محض ان کا ایک آئیڈیل تھا ورنہ اس عارضی دنیا کے بکھیڑوں سے وہ پوری طرح مبرا تھے۔ ماشاءاللہ کثیر العیال تھے۔ اپنی دو عدد شریک ہائے حیات سے انکے ایک درجن کے قریب بچے تھے۔ نندنا نالہ کے آر پار آباد اپنے دونوں گھرانوں کے ضرویات کا خیال رکھنے میں وہ ہر پل مصروف رہتے تھے۔ چشمے کے پانی سے سیراب ہونیوالی اپنی مختصر سی زرعی اراضی کو ہر دم سرسبز و شاداب رکھتے تھے۔ اس پہاڑی ندی پر بنائی گئی زرعی اجناس پیسنے والی پن چکی کا خیال بھی رکھتے تھے جہاں پر گندم اور دالیں پیسنے کی مزدوری جنس کی صورت میں وصول ہوتی تھی۔ مقامی سیاست کا بار گران بھی سنبھالے رکھتے تھے۔ کیونکہ قرآن کریم کے اس ارشاد گرامی سے کوئی مسلمان صرف نظر نہیں کرسکتا کہ ''اسلام میں رہبانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے''۔

__☆☆____☆☆____☆☆__

حاجی سید محمد علی شاہؒ

سید ایوب بخاری

آج کل تو حاجی صاحبان کی ہر جگہ بہتات ہے لیکن میں اس وقت کی بات کرتا ہوں جب ایسی شخصیات بہت کمیاب ہوتی تھیں اور کہیں کہیں ایسے برگزیدہ صاحبان کردار ملتے تھے جنہیں اللہ پاک نے حج کی سعادت سے بہرہ مند فرمایا ہوتا تھا۔ مجھے یاد کہ جب کبھی ہمارے ہاں حج کا ذکر ہوتا تو کہا جاتا سفر حج پر ایک سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ ایسے حجاج کرام صاحبان کردار ہوتے تھے ان کی اپنے حلقہ شناسائی میں قدر و منزلت قابل رشک ہوتی تھی۔ ایسے ہی دور کے حجاج کرام میں ہمارے خاندان کے ''حاجی صاحب لگھڑ والے'' بھی تھے۔ ان دنوں ایسی شخصیت کو ان کے ذاتی نام سے احتراماً نہ پکارتے تھے اس لیے بڑے عرصہ بعد ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے صاحب کا اسم گرامی محمد علی شاہؒ ہے۔ حاجی صاحب نے پہلا حج 1950ء میں کیا تھا۔ یہاں پر یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اسم گرامی کا ایک پس منظر ہے۔ ہمارا خاندان سید محمود المعروف پیر سباکؒ کے پوتے جو ایک نامور ہستی ہیں یعنی پیر سید زین الدین بانی بیت الغریب کی اولاد پر مشتمل ہے۔ موصوف کے دس بیٹے تھے راقم الحروف ان کے بیٹے حافظ سید محمد عمر کی اولاد میں سے ہے اور حاجی صاحبؒ ان کے دوسرے بیٹے پیر سید محمد علی شاہؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ حاجی صاحب کی نام گزاری انہیں بزرگوں کے نام پر ہوتی ہے۔ حاجی صاحب نے اپنے آپ کو موصوف کا جانشین برحق ثابت کیا ہے۔ جبکہ حاجی صاحبؒ اپنے آباؤ اجداد کے سجادہ کی قابل رشک زینت تھے۔ ان مختلف رجحانات اور بُعد فکری نظری کے باوجود حاجی صاحبؒ اور والد صاحبؒ کا جوڑ ہمیشہ پرخلوص اور محبت بھرا رہا۔ حاجی صاحبؒ پر نقشبندی مسلک کا اثر غالب تھا اور میرے ماموں سید میر احمد شاہ صاحبؒ جو میرے سسر بھی تھے اسی مسلک کے پیروکار بلکہ نمائندہ تھے۔ حاجی صاحبؒ عوامی زندگی میں بھرپور حصہ لیتے تھے اور پسماندہ طبقہ کے لوگوں کے کورٹ کچہری کے معاملات میں بھی ان کی

رہنمائی کرتے تھے۔ اس ضمن میں وہ بالعموم سید میر احمد شاہؒ موصوف جو دیوانی کے معروف وکیل تھے کے پاس ایسے لوگوں کے ساتھ آتے اور عدالتی معاملات کے فراغت کے وقت ان ملاقاتوں میں قانون کے علاوہ شریعت اور تصوف زیر بحث آتے اور خوب محفل جمتی جس سے دیگر صاحبان ذوق بھی فیض یاب ہوتے۔ پیر صاحب کے فرزند حاجی صاحبؒ سید محمد حسین شاہ مرحوم میرے بہنوئی تھے اور اس وجہ سے حاجی صاحبؒ سے اکثر شرف ملاقات رہتی۔ میں نے 1984ء میں بین الاقوامی پاسپورٹ پر سعودی ویزہ فروشوں سے لندن میں ویزہ خریدا اور فریضہ حج ادا کیا۔

حج کے دوران سعودی شرطوں کے ہاتھوں جو تکلیفیں برداشت کرنا پڑی تھیں ان کا تذکرہ ہر مبارک باد کے لیے آنے والے سے کرتا تھا۔ چنانچہ ایسے ہی موقع پر میں نے حاجی صاحبؒ کے سامنے یہ تذکرہ کیا تو انہوں نے فرمایا ''ایسی شکایات نہ کیا کرو عبادت میں جتنی صعوبتیں پیش آئیں خوشدلی سے برداشت کیا کرو اس سے ثواب میں اضافہ ہوتا ہے''۔ اس پر جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے حرم پاک میں تیس دن گزارے اور نماز پنجگانہ اور تہجد کے علاوہ پندرہ ختم القرآن کا شرف حاصل کیا اور ہر روز سو سو نفل بلا تکان ادا کیے تو حاجی صاحبؒ نے میرا ماتھا چوما اور مجھے سینے سے لگایا جس کی حدت میں آج تک محسوس کرتا ہوں۔ بے شک ایسی ہستیوں کو ہماری دعاؤں کی ضرورت نہیں لیکن یہ فرض ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے حاجی صاحبؒ کے لیے اعلیٰ مراتب کی عاجزانہ دعا باعتماد قبولیت کروں۔

__☆☆____☆☆____☆☆__

حرفِ دل

ڈاکٹر فہمیدہ تبسم

ڈاکٹر صاحبہ وفاقی اُردو یونیورسٹی اسلام آباد میں بطور پروفیسر خدمات سرانجام دے رہی ہیں ۔ اپنے مضمون میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ہولڈر ہونے کے ناطے لکھنا اُن کے لیے کوئی بڑی بات نہیں لیکن اپنے والد مرحوم کے ایک دوست ''اُستاد محترم'' اور اپنے گاوں کے پیر صاحب کے بارے میں جن کو انھوں نے بچپن میں صرف چند مرتبہ دیکھا۔ اُن کے بارے میں اپنی بچپن کی یاداشتوں کو مربوط کر کے اپنے والد مرحوم اور اُن کے ''اُستاد محترم ''پیر صاحب کے بارے میں عقیدت اور محبت کے ریشمی رومال میں لپٹی ہوئی تحریر پیش کر کے دونوں کا حق ادا کر دیا۔

ڈاکٹر صاحبہ کئی کتابوں اور مقالوں کی مصنفہ ہیں جن میں سے ایک کتاب'' اُحد کے آنسو'' میری نظر سے بھی گزر چکی ہے۔ یہ کتاب ایک سفر نامہ بھی ہے اور نبی پاک ﷺ کے بارے میں عقیدت کا گلدستہ بھی ہے۔ کتاب میں جا بجا اُن کی اپنے دین اسلام اور آقائے نامدار ﷺ سے عشق میں ڈوبی تحریر یں پڑھ کر قاری پر ان کی شخصیت کا ایک سحر طاری ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کی اس التفات میں اُن کے بھائی جناب نذیر احمد کا حصہ بھی ہے جو وقتاً فوقتاً اُن کے اور ہمارے درمیان ''پیامی'' کا کردار بھی ادا کرتے رہے۔ (Nazir Payami ان کی email کی آئی۔ ڈی ہے)۔

۴ جنوری ۱۹۹۹ء کی ایک سوگوار صبح میں اپنے صحن میں کھڑی ایک ایسے منظر میں گم تھی جسے میری چشمِ بازیافت نے ماضی کی سنہری یادوں سے مستعار لے کر امروز کے دریچے میں آراستہ کیا تھا۔ ابا

جان کی راہ عدم پہ روانگی کا دوسرا دن تھا میرے جوار قلب میں ایک لطیف سی دستک کے ساتھ ایک مہربان آواز سنائی دے رہی تھی'' حافظ جی صاحب''۔۔۔اور حافظ جی صاحب ہیں کہ اس دستک پہ لبیک کہتے ہوئے یوں دروازے کی جانب لپکتے ہیں کہ نہ پاؤں میں جوتے کا خیال نہ اس مصروفیت کا دھیان جسے لے کے بیٹھے ہیں اور دروازے کے کھلتے ہی یوں سرشار ہوتے ہیں گویا باہر ان کے مرشد و راہنما نہیں جنت الفردوس اپنے مہرباں در کھولے کھڑی ہو۔

میں نے اپنے والد صاحب کو کسی اور ہستی کے سامنے یوں سراپا نیاز کبھی نہیں دیکھا۔کیا جمیل ہستیاں تھے طالب ومطلوب، عاشق ومعشوق، مقصد ومقصود۔۔۔۔ایسا دیکھا نہ سنا۔۔۔استاد محترم ہمارے گھر تشریف لاتے تو گویا نور کی برسات لیے آتے ۔اپنے شاگرد رشید کو جب حافظ جی صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تو لگتا تہذیب شائستگی اور وقار خلوص ذات کی چاشنی میں گھل کر سماعتوں میں اتر رہا ہے...........

وہ میرے بچپن کی چمکیلی صبحیں تھیں جب بے داغ سفید لباس میں ملبوس، سر پہ عمامہ باندھے ،اپنے لباس کی طرح اجلے اور روشن چہرے والے پیر صاحب ہمارے کچے صحن کی ایک چارپائی پر رونق افروز ہوتے اور والد محترم کے ساتھ علمی و دینی معاملات پر گفتگو فرماتے۔میں ان کے تبسم و تکلم پہ آج بھی فدا ہوں ان کی باحجاب نظریں کبھی پوری نہیں اٹھیں اور نور کا ایک ہالہ ہمیشہ ان کے گرد رہا۔۔گو مجھے ان کا عرفان ذات اس وقت پوری طرح میسر نہ تھا وہ میرے عہد طفولیت کے ایام تھے لیکن آج تک وہ شیریں سخن ہستی اور اس کی روحانی تاثیر میری یادداشت پر حاوی ہے میں دنیا کے بے شمار فصیح البیان مقررین و مبلغین کو سننے اور جاننے کے باوصف ان میں سے کسی ایک کو بھی اس قلب گداز اور کردار و عمل کا حامل نہیں سمجھتی جو پیر محمد علی شاہ صاحب کو بارگاہ خداوندی سے عطا ہوا تھا۔

مکہ و مدینہ کی منور فضاؤں میں مجھے پیر صاحب اور اپنے والد محترم کی یاد ہمیشہ آتی ہے مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ دونوں فردوس مکیں یہیں موجود ہیں۔

پیر محمد علی شاہ صاحب روایتی معنوں میں پیر نہیں تھے نہ انہوں نے کوئی گدی سنبھالی نہ اپنا جانشین مقرر کیا وہ دنیاداری اور ملمع سازی سے بے نیاز حقیقی معنوں میں درویش تھے۔شرک اور بدعت سے کوسوں دور توحید حقیقی کے علمبردار اور سنت رسولؐ کے پیروکار تھے۔ان کو اللہ نے ظاہری و باطنی حسن سے مالا مال کر رکھا تھا شاید یہ شعر انہی کے لیے کہا گیا ہے۔

تیری صورت کو دیکھنے والے
اپنی آنکھوں سے پیار کرتے ہیں

1985ء کا ایک پریشان کن دن تھا جب والد صاحب گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے جیسے کوئی متاع عزیز گم ہوگئی ہو جلدی جلدی میرے بھائیوں کا پوچھا اور عجلت میں بتایا کہ پیر صاحب کا وصال ہوگیا ہے اور دونوں کو ساتھ لے کر گکھڑ چلے گئے۔۔نماز جنازہ کی ادائیگی کے بعد اسی شب میرے والد صاحب کو بتادیا گیا کہ ان کے عزیز و محترم استاد گرامی کا رتبہ کیا ہے۔۔۔ابا جان کے بقول:

"میری نظروں کے سامنے جنازہ گاہ کا پورا منظر کھلا تھا نماز جنازہ کی ادائیگی ہوتے ہی سفید لباس میں ملبوس ایک شخص اچانک سامنے آیا اور سارے مجمع کو مخاطب کر کے کہا: آج اس جنازے میں جتنے لوگ شریک ہیں ان سب کا حج قبول ہوگیا ہے۔۔۔"

ابا جان نے مزید کہا کہ میں نے فوراً اپنے اردگرد دیکھا کہ نذیر احمد اور پرویز اختر (میرے بھائی) اس وقت موجود ہیں یا نہیں دیکھا تو وہ دونوں ساتھ ہی کھڑے تھے۔۔۔

روح کی وادیوں میں جھانکنے والے اور قلب باصفا کے حامل بخوبی جان سکتے ہیں کہ اللہ کے ہاں اپنے دوستوں کا کیا رتبہ ہوا کرتا ہے۔۔۔موت ایک ظاہری کیفیت ہے جو ہر بشر پر لازماً طاری ہوتی ہے ورنہ خدائی دوستوں کا تو یہ حال ہوتا ہے:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو تیرا بدن
تیرے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

اللہ تعالیٰ نے جو نفس مطمئنہ اپنے سچے دوست کو عطا کیا تھا اور جس طرح اپنے ہاں قبولیت عطا فرمائی وہ ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتی۔میرے والد محترم پیر صاحب کے وسیع المطالعہ ہونے کا اکثر ذکر فرماتے۔دونوں کے مابین کتب دینیہ کا تبادلہ بھی ہوا کرتا یہ کتب کسی مخصوص مکتب فکر سے متعلقہ نہیں ہوتی تھیں ان کے زیر مطالعہ جدید مذہبی افکار بھی رہتے مولانا مودودی سے پرویز صاحب تک ہر فکر سے استفادہ فرماتے اور بلا تعصب ہر مکتب فکر کی حسنات سے مستفید ہوتے۔جدید ذرائع ابلاغ نے کئی بتان عصر حاضر کو"پیرو مرشد" کا روپ دے کر پردہ سیمیں کی زینت بنادیا ہے عقیدت کے مارے لوگوں کو صراط مستقیم کی بجائے جہالت کی وادیوں میں دھکیلا جارہا ہے۔ہر دوسرے قدم پر ایک آستانہ سجا ہوا ہے جہاں سوز قلب سے عاری کاروباری مرشد بیٹھے ہیں اور جو اللہ کے حقیقی درویش تھے انہوں نے نیک نامی، خدا پرستی اور عشق رسولؐ کی بیش بہا جاگیر چھوڑی لیکن میراث میں مصنوعی مسند ارشاد نہیں چھوڑی، نہ کوئی مجاور نہ کوئی رسم چراغاں مگر ایسی محترم و مکرم اولاد کہ جو اپنے والد گرامی کے ورثے کی بہترین امین بھی ہے اور" جو مجھ کو دیکھ لے اس کو تیرا دیدار ہو جائے" کی تفسیر بھی ہے۔

مجھے یہ سطور تحریر کرتے ہوئے بے پناہ مسرت اور فخر ہو رہا ہے میں نے جو کچھ لکھا یہ اس عظیم و مہرباں ہستی کے بے پناہ خصائص کے مقابلے میں پرکاہ برابر بھی نہیں۔میرا قلم اتنا توانا نہیں کہ اس پاکباز روح کے فیضان کو سمیٹے اور قرطاس پہ منتقل کرے لیکن یہ چند لفظ تحریر کرتے ہوئے آج میں اپنے شفیق والد محترم کے سامنے سرخ رو ہوگئی ہوں گو میری تہی دامانی اس عقیدت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے جو میرے والد کے دل میں اپنے استاد محترم کے لیے موجزن تھی بس میں نے اپنی ناتواں کوشش کی ہے گر زہے قبول افتند باعث عز و شرف ما۔

اللہ رب العزت محترم سید مشتاق حسین شاہ صاحب کی یہ شاندار تحریری عقیدت قبول فرمائیں اور محترم پیر صاحب کے پورے خاندان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

__☆☆____☆☆____☆☆__



پیر طریقت الحاج سید محمد علی شاہ مرحوم

آغاز جوانی سے علم، عبادت اور فقر کی طرف مائل تھے

سید مشتاق حسین شاہ

(روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی 17 نومبر 1991)

بزرگ ہستیوں میں ایک بزرگ حضرت پیر سید محمد علی شاہ بھی گزرے ہیں۔ جنہوں نے اپنی ساری زندگی خداوند تعالیٰ کی عبادت اور مخلوق خدا کی ہدایت اور اُن کی خدمت میں گزاری۔ پیر صاحب کا تعلق بخاری سادات پیر سباک کی ایک معزز شاخ سے تھا۔ مشہور و معروف بزرگ اور ولی کامل حضرت محمود شاہ المعروف پیر سباک علیہ رحمت کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے بزرگ موضع پیر سباک ضلع نوشہرہ (صوبہ سرحد) سے ہجرت کر کے ضلع اٹک، ضلع میانوالی، ضلع راولپنڈی، ضلع بنوں، ضلع لکی مروت اور ضلع کوہاٹ میں آباد ہو گئے۔ تو آپ کے والد حاجی الحرمین پیر سید میاں گل شاہ نے ضلع اٹک کی تحصیل فتح جنگ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''لنگر'' کو اپنے نئے مسکن کے طور پر منتخب کر کے اس علاقے کے لوگوں کو ہدایت کا فریضہ انجام دینا شروع کر دیا۔ اِسی گاؤں میں پیر صاحب کی ولادت ہوئی۔ آپ ابھی کم سن ہی تھے کہ آپ کے والد بزرگوار حاجی الحرمین الشرفین ''سید میاں گل شاہ'' اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔

اپنے والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد ہونے کی وجہ سے گھر اور خاندان کی پوری ذمہ داری بھی ان کے کندھوں پر آ پڑی۔ بچپن اور آغاز جوانی سے طبیعت علم، عبادت اور فقر کی طرف مائل تھی۔ چنانچہ مختلف دینی مدرسوں میں علاقے کے چند علماء سے اس وقت کے دستور کے مطابق دینی تعلیم کے ساتھ۔ عربی، فارسی، فقہ تفسیر اور طب کے علوم میں دسترس حاصل کی۔ عالم شباب میں کم سن اولاد کی یکے بعد دیگرے وفات سے دل پر چوٹ لگی۔ تو اطمینان قلب کے لیے عبادت کُلی کی طرف مائل ہوئے۔ اس دور میں ایک روز خواب میں آپ کو اشارہ ہوا۔ تو سب کچھ چھوڑ کر اپنے دور کی ایک معروف شخصیت اور سلسلہ نقشبندیہ کے ایک بزرگ غوث زمان ''حضرت خواجہ عبدالرحیم'' المعروف خواجہ باغدوری کی خدمت میں

حاضر ہوئے۔ آپ کے پوچھنے پر عرض کی کہ ''حضور مجھے سکون قلب کے لیے علاج کرانا ہے۔'' خواجہ باغدوری نے فرمایا کہ رات گزاریں آپ کے لیے کل صبح نسخہ تجویز کیا جائے گا۔ دوسرے دن صبح خواجہ باغدوری نے درود وظائف کا نسخہ عطا فرمایا۔ اور فرمایا یہ وظیفہ چالیس دن تک کریں۔ اگر اس سے سکون قلب حاصل ہو جائے تو چالیس دن بعد آ جانا، اور اگر سکون قلب حاصل نہ ہو تو پھر کسی اور روحانی حکیم سے رجوع کرنا۔ پیر صاحب مرحوم خواب میں جو نقشہ دیکھ چکے تھے۔ وہی نقشہ اور وہی منظر خواجہ باغدوری کی شبیہ مبارک میں پایا۔ اور واپس تشریف لائے۔ پیر صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے واپسی پر بمشکل ایک ہفتہ گھر پر گزارہ ہو گا کہ ماہئی بے آب کی طرح مرشد کی یاد نے تڑپایا۔ چنانچہ چالیس دن کی چلہ کشی کے بعد مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو روحانی حکیم خواجہ باغدوری نے پوچھا'' شاہ صاحب ہمارے علاج سے افاقہ ہوا یا نہیں''۔ جواباً فرمایا۔ حضور آپکا نسخہ تیز تہدف تھا اور اب انشاءاللہ پہلے سے بہتر ہوں۔ اس پر خواجہ باغدوری نے ہدایت کی کہ اب آپ واپس چلے جائیں۔ اور اس نسخے کا استعمال جاری رکھیں۔ اور مخلوق خدا کو خدا اور رسول معلمؐ کی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔ اس ملاقات نے آپکی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ اور آپ نے اپنے شیخ کی ہدایت پر اپنی زندگی انسانوں کی ہدایت اور فلاح بہبود کے لیے وقف کر دی۔

اہل تصوف کے ہاں روحانی تربیت کے لیے مدارج ہیں۔ پہلا درجہ شریعت کا ہے۔ جس میں صوفیائے کرام اپنے آپ کو شریعت کا پابند بناتے ہیں۔ اپنی زندگی شرعی اصولوں کے مطابق گزارتے ہیں۔ وہ نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ جب وہ اس طرح اپنی زندگیوں کو اسلامی نظم وضبط کا پابند کر لیتے ہیں۔ تو دوسرے دور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جسے طریقت کہتے ہیں۔ اس راہ میں وہ شریعت کے پابند رہتے ہوئے اپنے شیخ یا پیر کی رہنمائی میں تزکیہ نفس کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اور اپنی خواہشات کو رضائے الٰہی کا تابع بناتے ہیں۔ انہیں اپنے شیخ سے محبت کا سبق دیا جاتا ہے۔ جب شیخ اسے اپنے حلقے میں شامل کرتا ہے۔ تو اسے تصوف کے مسلک اور اصولوں کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ شیخ کی ہدایت پر وہ شخص جو تصوف کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ خدمت خلق، انکساری اور راتوں کو عبادت

اور روزے رکھنے کی عبادت کو اپنا معمول بناتا ہے۔ قبلہ پیر صاحب نے اپنے پیرومرشد اور شیخ کے احکامات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے لنگر قائم کر کے غربا اور مساکین کو کھانا کھلانا شروع کیا۔ اور یہ سلسلہ تادم آخر قائم و دائم رہا۔ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب ''منہاج العابدین'' میں مشہور صوفی بزرگ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کا ایک قول نقل کیا ہے ''تم لوگوں سے بظاہر ملے جلے رہو، مگر تمہاری انسیت اور محبت صرف اللہ کے ساتھ ہو لوگوں کے ساتھ تمہارا قلبی تعلق نہ ہو''۔ بزرگان دین کے ان اقوال کی روشنی میں جب ہم پیر صاحب علیہ رحمت کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ پیر صاحب سید محمد علی شاہ جو صاحب علم و فضل تھے۔ اور ان صفات عالیہ سے متصف تھے۔ عبادت، ریاضت اور سلوک کے مدارج طے کرنے کے ساتھ ساتھ دنیاوی زندگی سے کٹ کر گوشہ نشینی اور معروف معنوں میں ترک دنیا کی زندگی اختیار نہیں کی۔ بلکہ لوگوں کے اندر رہ کر اور ان کے ساتھ زندگی گزار کر ان کیلیے ہدایت کا سامان بہم پہنچاتے رہے۔ آپ نے اپنے بزرگوں کی طرح دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے زمینداری اور تجارت کو اپنا وسیلہ روزگار بنایا۔ اور اپنی روحانی اور باطنی حیثیت کو کبھی بھی اپنے لیے روزگار زندگی کا وسیلہ نہیں بننے دیا۔ بلکہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے اپنے بچوں کی پرورش کی۔ اور اسی کمائی کو راہ خدا میں صرف کیا۔ عربی، فارسی اور دینی علوم کے جید عالم تھے۔ اسی لیے نہ صرف عوام بلکہ بعض اوقات خواص اور علمائے علاقہ بھی آکر آپ سے دینی مسائل کے بارے میں رہنمائی حاصل کرتے۔ اپنے علم کی کبھی تشہیر نہ کی اور نہ کبھی علمی غرور اور تکبر کو اپنے نزدیک آنے دیا۔ ہر مسئلے کا اتنا موثر اور دلنشیں انداز میں جواب دیتے کہ سائل کی مکمل تشفی کر دیتے۔ قرآن، حدیث، تفسیر فقہ اور صرف و نحو پر عربی، فارسی، اُردو، پشتو اور پنجابی میں قیمتی اور نادر کتب کا ایک ذخیرہ آپ کے پاس موجود تھا۔ طب اسلامی اور طب یونانی پر بھی آپ کو عبور حاصل تھا۔ ان کے کئی امراض کے نہایت قیمتی اور مجرب نسخے موجود تھے۔ جن کو آپ نے ساری عمر مخلوق خدا کے فائدے کے لیے استعمال کیا۔

گھر میں عام استعمال کی دواؤں کا ایک دواخانہ تھا۔ جس سے پسماندہ اور صاحب ثروت دونوں طبقات کو اپنے دواخانے کی دوائیاں ساری عمر مفت مہیا کیں۔ الحمدللہ۔ اور زندگی بھر کسی دوائی اور علاج کا ایک پیسہ تک نہ لیا۔ کوئی دوائی موجود نہ ہوتی۔ تو اس کو نسخہ لکھ دیتے اور دوائی تیار کر کے دے دیتے۔

تمام بزرگان دین کی طرح حُب رسول ﷺ اور عشق حبیب ﷺ آپ کا طرہ امتیاز تھا۔ جب کبھی نماز جمعہ کے خطبے اور عام مجلس میں حضور ﷺ کا اسم گرامی زبان پر آتا یا حضور ﷺ کے فضائل کا ذکر ہو جاتا۔ تو آپ کا دل جذبات سے بے قابو ہو جاتا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تیرنے لگتی۔ اپنی تقریر اور باتوں میں حضور ﷺ کا ذکر اتنی کثرت سے کرتے کہ یہ گمان ہونے لگتا۔ کہ آپ کا موضوع ہی یہی ہے۔ ایک دفعہ آپ کے ایک کم سن پوتے (اب کرنل ڈاکٹر ارشاد حسین) نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ کو پتہ چلا تو اُسے اپنے پاس بلایا جب اُس نے تصدیق کی۔ تو اُس کو گود میں اُٹھا کر اُس کی آنکھوں اور پیشانی کو چوم چوم لیا اور فرمایا۔ کہ ان آنکھوں کو اس لیے چومتا ہوں کہ انہوں نے حضور ﷺ کا دیدار کیا ہے۔ اسی عشق رسول کے جذبے کے تحت دو مرتبہ حج مبارک کی سعادت نصیب ہوئی۔ حج کے دوران روضہ رسول ﷺ پر حاضری کو ساری عمر باقی زندگی کا قیمتی ترین اثاثہ قرار دیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت، زہد و تقویٰ میں وہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں اور بزرگان دین کا مثالی نمونہ تھے۔ رات بھر عبادت ان کا معمول تھا۔ بقول حفیظ جالندھری۔

مشقت کے لئے دن تھے عبادت کے لیے راتیں

قرآن کی تلاوت اور دیگر وظائف باقاعدگی سے ادا کرتے۔ اور یہ عمل انتہائی مصروفیات حتیٰ کہ بیماری میں بھی جاری رہتا۔ اپنے بچوں کو نماز کی تلقین کرتے ایک دن ان کے منہ سے اچانک یہ الفاظ نکلے۔ کہ میں نے جب سے بلوغت میں قدم رکھا مجھے یاد نہیں پڑتا کہ مجھ سے کہیں نماز قضا ہوئی ہے۔

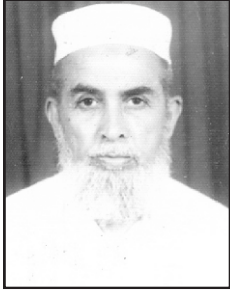
راقم الحروف سے گفتگو میں مرحوم نے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ وہ اپنے پیر و مرشد خواجہ عبدالرحیمؒ باغدوری کی علالت کے دوران خدمت کے لیے پشاور لیڈی ریڈنگ ہسپتال آئے۔ تو اتفاق سے قائد اعظم محمد علی جناح بھی وہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب قائد اعظم مرحوم مسلم لیگ کی تنظیم نو کے سلسلے میں پورے برصغیر کے دورے پر تھے۔ ان کے جلسۂ عام سے خطاب کی اطلاع پر آپ جلسہ گاہ تشریف لے گئے۔ اور بتایا کہ قائداعظم مرحوم اگرچہ انگریزی زبان میں خطاب کر رہے تھے مگر عوام اتنی توجہ سے ان کی تقریر سُن رہے تھے۔ گویا وہ عوام کی زبان میں انہیں مخاطب ہوں۔ آپ فخر یہ بتاتے تھے۔ کہ آپ نے قائداعظم جیسے عظیم اور مردِ مومن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ 1965ء

کی پاک بھارت جنگ کے دوران راقم الحروف ایف۔اے کے امتحان سے فارغ ہو کر گاؤں میں چھٹیاں گزار رہا تھا۔ ایک دن اپنے پاس بُلا کر جنگ کے بارے میں اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔ راقم الحروف نے نے جب آپکو بتایا کہ خاکسار نے گذشتہ روز رضا کاروں اور مجاہدین میں شمولیت کے لیے اپنا نام درج کروادیا ہے تاکہ عملی طور پر وطن عزیز کے لیے کام آسکوں۔ تو انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔ اور نیک تمناؤں اور کامیابیوں سے ہمکنار ہونے کی دُعا فرمائی اور جنگ کے دوران آپ رات دن پاکستان اور افواج پاکستان کی کامیابی کے لیے دُعائیں فرماتے رہے۔ اور مسجد میں نمازیوں اور اہل محلّہ کو بھی اس وقت کی نزاکت سے آگاہ کرتے رہے۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران آپ کا ایک بیٹا سید حمید شاہ اور داماد سید محمد جُنید شاہ نیز خاندان سادات پیر سباک کے دیگر چند نوجوان جن میں میجر سید منور شاہ تبی سر، سید علی اصغر شاہ لنگر شامل تھے ساتھ مشرقی پاکستان میں اپنی جانیں پیش کئے ہوئے تھے۔ اور جو بالآخر جنگی قیدی بنا لیے گئے۔ پیر صاحب کو سادات پیر سباک کے ان مجاہدوں کی قوم ملک و مذہب کی خاطر مردانِ مومن پر فخر کرتے تھے۔ پیر صاحب اپنی روزمرہ زندگی میں انتہائی سخی تھے۔ غریبوں اور حاجت مندوں کو کبھی بھی اپنے دروازے سے خالی نہیں جانے دیا۔ آپ چھپ کر غریبوں اور مساکین کی خدمت کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی وفات حسرت پر علاقے اور گاؤں کے لوگ اپنے آپ کو بے یار و مددگار تصور کرنے لگے۔

ساری عمر تقویٰ اور پرہیز گاری میں گزاری۔ دوسروں کو اپنے علم اور زُہد سے منور کرنے والا اور دوسروں کے لیے راہ بنانے اور دکھانے والا یہ روشن ستارہ 18 دسمبر 1985ء کو اپنے 9 جوان بیٹوں ایک بیٹی اور ہزاروں عقیدت مندوں کو سوگوار چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

__☆☆____☆☆____☆☆__



کچھ قبلہ و کعبہ پیر طریقت
سید محمد علی شاہ
مرحوم و مغفور کے بارے میں

قربان حسین شاہ

سید قربان حسین شاہ ہمارے بھائیوں میں پانچویں نمبر پر ھیں۔ واپڈا سے ایس۔ ڈی۔ او ریٹائر ہوئے ھیں۔ ادب اور تاریخ کا وسیع مطالعہ بھی ھے اور لکھنے کا ذوق بھی۔ اخبارات میں مضامین لکھتے ھیں۔ نظریہ پاکستان سے گہری وابستگی ھے اور اسلامی تاریخ سے بھی۔ والدم بزرگوار کے بارے میں ان کی یاداشتوں کا ایک بڑا سرمایہ اس کتاب کی قدر و قیمت کا سبب بنا۔ کتاب کی تکمیل کے مختلف مراحل میں ان کی راهنمائی اور حوصلہ افزائی میرے شامل حال رھی۔

الحاج سید محمد علی شاہؒ بخاری المعروف پیر صاحب مرحوم لنگر تحصیل فتح جنگ ضلع اٹک کے ایک سادات بخاری خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپؒ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ایک بہن بھی تھی۔ والدین نے پیر صاحب کی ذہنی و مذہبی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اور اُس وقت کے دو مقامات پر جید اور عالم باعمل شخصیات کی تربیت نے پیر صاحب کو وہ سب کچھ عطا کیا۔ جو آنے والی زندگی میں قبلہ پیر صاحب کے لیے دُنیا اور آخرت میں کامیابی اور کامرانی کا سبب بنا۔ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ پیر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دو بچے عطا کیے۔ جو یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جس پر پیر صاحب مرحوم کو دلی صدمہ ہوا۔ ایک رات خواب میں غوث زماں قبلہ خواجہ عبدالرحیمؒ باغدروی کے پاس حاضری دینے کا اشارہ ملا۔ سو تلاش کرتے کرتے خواجہ باغدوری کے دربار تک پہنچ گئے۔ بعد نماز عشاء خواجہ باغدروی نے آنے کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ خواجہ حضور اطمینان قلب کا

متلاشی ہوں۔خواجہ باغدروی بھی مرتبے کے مالک اور خدا رسیدہ شخصیت تھے۔تو فرمایا ''رات گزارو' صبح نسخہ تجویز کیا جائے گا۔پیر صاحب کے بقول رات مختلف سوالات و خدشات میں گزری۔صبح جب خواجہ باغدوریؒ سے پھر ملاقات ہوئی تو اُن کے منہ سے جوں جوں درود وظائف کا نسخہ بتایا جا رہا تھا۔ میرے دل ودماغ کی حالت تبدیل ہو رہی تھی اس مردِ حق نے یہ وظیفہ چالیس دن تک گھر میں پورا کرنے کا حکم دیا۔فقیر نے (پیر صاحب) نے گھر آ کر اس وظیفے کا ورد شروع کیا۔اللہ کی شان ادھر وظیفہ اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ اُدھر خواجہ باغدوریؒ کی یاد ستا رہی تھی۔عجیب کشمکش تھی دل چاہتا تھا کہ اس چالیس روز دورانئے کی تکمیل سے پہلے پھر خواجہ باغدروی کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں لیکن چالیس روزہ چلہ اور وظیفے بھی اس مُرشد کا حکم تھا۔جس کو پورا کرنے کے بعد بھی دوسرے امتحان کے لیے حاضر ہونا ضروری تھا۔سو یہ مرحلہ جب پورے اطمیان اور خوش اسلوبی سے پورا ہو چکا اور مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خواجہ باغدوریؒ نے فرمایا کہ واپس جاؤ اور مخلوق خدا کی خدمت کرو۔نیز اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکامات و ہدایات مخلوق خدا تک پہنچاؤ۔اس کے بعد کوہاٹ میں قبلہ حاجی بہادر بابا صاحب کے مزار پر چلہ کشی کی۔اور آخری رات ایک آواز آئی کہ ''ہاتھ اُٹھاؤ'' جب ہاتھ اُٹھائے تو کسی نے مصافحہ کی طرح ہاتھ ملایا اور فرمایا کہ جاؤ۔رحمان و رحیم ذات نے تمھاری حاضری و عاجزی کو شرفِ قبولیت بخش دیا ہے۔

قبلہ پیر صاحب چونکہ ایک عالم باعمل انسان تھے۔لہٰذا وہ اپنی کرامات کا اظہار بہت کم ظاہر فرمایا کرتے تھے۔ایک دفعہ جب آپ نے احباب کے ہاں تحصیل لکی مروت (جواب ضلع لکی مروت ہے) کے موضع تاجہ زئی سے موضع خواجہ خیل جا رہے تھے سفر پیدل تھا۔راستے میں ایک گھر سے دو بڑے خونخوار کُتے بھونکتے ہوئے نکلے اور پیر صاحب کے معتقدین کی طرف دوڑے۔ایک عزیز سید محبوب شاہ صاحب خواجہ خیل مرحوم نے کہا کہ پیر صاحب یہ کُتے بڑے خونخوار ہیں اور ہم خالی ہاتھ ہیں۔پیر صاحب نے فرمایا کہ جب حضور ﷺ عرب و عجم نے مکہ معظّمہ سے ہجرت فرمائی تو آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی خالی ہاتھ تھے لیکن اللہ تعالیٰ پر توکل تھا۔سید محبوب شاہ کا کہنا تھا کہ پیر صاحب نے کچھ پڑھ کر کتوں کی طرف پھونکا تو

کُتے اُسی جگہ جامد ہو گئے اور جب ہم کچھ دور گئے تو پیر صاحب نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو کُتے واپس چلے گئے۔ پیر صاحب چونکہ انتہائی عبادت گُزار اور اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکامات کے پابند اور حضور ﷺ کے در کے غلام تھے اس طرز عمل اور طرز عبادت نے اُنہیں واقف ناواقف سب کی نظروں میں اُونچا اعلیٰ مقام دے رکھا تھا۔آپ اپنے گاؤں کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن خطبہ فرماتے۔آپ فرماتے کہ خدا کا شکر ادا کرو جس نے ہمیں انسان اور حضور ﷺ کا اُمتی پیدا کیا۔آپ نے زندگی میں دو دفعہ حج بیت اللہ کیا اور حضور ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضری دی۔پہلی دفعہ آپ نے 1950 میں بذریعہ سمندری جہاز تشریف لے گئے۔آپ کے ہمراہ گکھڑ سے بابا فضل احمد لوہار اور اُن کی اہلیہ تھی جبکہ موضع لنگر سے بابا فتح محمد موچی شریک سفر تھے۔حج کی ادائیگی کے بعد چاروں صاحبان بخیریت اپنے گھروں کو واپس لوٹے۔

پیر صاحب مرحوم کو دوبارہ حج کی سعادت اُس وقت نصیب ہوئی جب اُن کے ایک صاحبزادے سید حمید شاہ پاک فوج میں ہوتے ہوئے سعودی عرب میں خدمات انجام دے رہے تھے۔سو اُس کی خواہش پر پیر صاحب نے دوسرا حج بذریعہ ہوائی جہاز ادا کیا۔اس طرح برادرم حمید شاہ نے پیر صاحب کی پوری خدمت کی۔اللہ تعالیٰ اُسے جزائے خیر دے۔ (آمین)

پیر صاحب ایک عالم باعمل اور اولیائے کرام کے معتقد اور صحیح العقیدہ بزرگ تھے۔عبادت و ریاضت پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔آخر جب بیمار ہوئے تو پشاور کی لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں انہیں داخل کروایا گیا۔اس وقت آپ کے پاس تین بیٹے سید فدا حسین شاہ، سید قُربان حسین شاہ اور سید مشتاق حسین شاہ موجود تھے۔آپ 18 دسمبر 1985ء کو نہ صرف اپنے لواحقین بلکہ علاقے بھر کے لوگوں سمیت کوہاٹ، لکی مروت، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان اور پشاور میں اپنے معتقدین کو آہوں سسکیوں میں چھوڑ کر اس دُنیا سے رُخصت ہوئے۔یاد رہے کہ اس دن جب میر باز خان خواجہ خیل جو قبلہ پیر صاحب کے انتہائی قریبی معتقدین میں شامل تھے جب ہمارے حجرے میں آئے تو خاکسار کو اُن کے ساتھ کمرے میں بیٹھنا پڑا اس وقت میر باز خان مرحوم رو رہے تھے اور جب انہوں نے روتے ہوئے کہا کہ پیر

صاحب میرے پیر میرے مہربان میرے دُعا گو میرے صلاح کار تھے تو خاکسار نے کہا کہ آپ روئیں نہیں پیر صاحب کے لیے دُعا کریں علاقے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمارا پیر صاحب سفید پوش، عالم، مہربان اور ہر تکلیف اور مُصیبت کے وقت کام آنے والا ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا ہے۔ ہم بھائیوں سے سب کچھ چلا گیا ہے اور ہمارے سروں سے ایک دُعاؤں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ ہسپتال میں داخلے سے وقت وفات تک خواجہ خیل خاندان کے ایک انتہائی معتقد، نیک دل جانثار ''میر باز خان مرحوم'' نے ابھی اپنے آپ کو پیر صاحب کی خدمت میں پیش پیش رکھا۔

یاد رہے کہ قبلہ پیر صاحب مرحوم اپنے روحانی پیشوا اعلیٰ حضرت خواجہ عبدالرحیم باغدوری عمر عزیز کے آخری وقت جب برائے علاج اسی لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ تو قبلہ پیر صاحب خواجہ باغدوری مرحوم کی خدمت میں مصروف تھے۔ انہی دنوں قائداعظم مرحوم بھی پشاور کے دورے پر تشریف لے گئے اور اُس وقت کے کننگھم پارک نزد بالا حصار اور آج کے جناح پارک میں قائداعظم مرحوم نے ایک تاریخی جلسے سے خطاب کیا۔ اللہ کی شان سے ہسپتال میں پیر صاحب مرحوم نے قبلہ باغدوری کی خدمت کی۔ اُسی ہسپتال میں قبلہ پیر صاحب کو علاج کے لیے داخل کرایا گیا۔ اور اُن کی خدمت کے لیے پیر صاحب کے تین بیٹے موجود تھے۔ یعنی پیر صاحب کو قبلہ باغدوری کی خدمت کے بدلے میں اللہ رحمان و رحیم نے تین بیٹے مقرر فرما دیئے۔ یہ اللہ کی شان ہے کسی نیک اور خدا رسیدہ کی خدمت اللہ تعالیٰ ضائع نہیں فرماتا۔

قبلہ پیر صاحب نے عام پیران صاحبان اور سجادہ نشین حضرات کی طرح کبھی بھی ایسا دعویٰ نہیں کیا جس سے اُن کے حلقہ احباب اُنہیں بڑا بزرگ سمجھیں۔ ہر وقت اپنے آپ کو ''فقیر اور حقیر'' لکھا اور کہا۔ کبھی ایسے بول زبان پر نہ نکالے جو فخر اور غرور ظاہر کرتے ہوں۔ پورے سکون اور محبت سے باتیں کرتے سُنتے اور جواب دیا کرتے تھے۔

خاکسار کو اجازت دی جائے کہ کچھ ایسی باتیں لکھوں جو میری آپ بیتی سے تعلق رکھتی ہیں۔

خاکسار ملازمت کے سلسلے میں پشاور میں مقیم تھا۔ اللہ کی شان کہ میرے ایک افسر جن کا چارسدہ سے تعلق

تھا۔ اُنہوں نے خواہ مخواہ مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ روزانہ یا ہفتے میں ایک دو مجھ سے جواب طلبیاں شروع ہو گئیں میرے لیے کوئی دوسرا راستہ، طریقہ اور ذریعہ نہیں تھا سو قبلہ والدم صاحب مرحوم و مغفور کو پورا قصہ سُنایا۔ میری گذارش کو پوری توجہ سے سنا اور فرمایا کہ دنیاوی معاملات اور ملازمت میں ایسے واقعات ہوتے ہیں صبر کرو اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا۔ اللہ کی شان کہ ایک ماہ بعد وہ افسر پشاور سے سکھر سندھ تبدیل کر دیا گیا۔ اس بات نے محکمے کے افسران اور ملازمین میں ہلچل پیدا کر دی چونکہ افسر موصوف کے بھی تعلقات اعلیٰ سطح تک تھے۔ اُنہوں نے اپنا زور لگایا۔ لیکن وہ اپنا تبادلہ منسوخ نہ کرا سکے۔ کچھ اہل نظر دوستوں نے اس واقعہ کو قبلہ پیر صاحب کی بددُعا کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن بندہ نے خاموشی سے کام لیا۔ اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ پیش آیا۔ محکمہ ہٰذا کے ایک سپرنٹنڈنگ انجینئر جن کا تعلق گلگت سے تھا اور وہ بھی سکھر سے تبدیل ہو کر یہاں آئے۔ سٹاف کے لوگوں نے پہلے سے موجود سپرنٹنڈنگ انجینئر اور نئے سپرنٹنڈنگ انجینئر کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام پشاور سٹی گرد سٹیشن میں کیا۔ ظاہر ہے موقع محل کے لحاظ سے دونوں افسران صاحبان نے بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرنا تھا اور سٹاف کی طرف سے خاکسار پر ورکروں کے مطالبات اور درپیش مسائل کا پیش کرنا میرے ذمے ٹھہرا۔ خاکسار نے مسائل مطالبات کا ذکر کیا اور افسران صاحبان سے گزارش کی کہ وطن عزیز اگست 1947ء میں غیر ملکی حاکموں سے آزاد کرا لیا گیا ہے لیکن ملازمین کے ساتھ اعلیٰ افسران کا رویہ وہی غیر ملکی حاکموں جیسا ہے۔ وہی Explanation وہی Charg sheet وہی Suspension وہی Demotion وہی Annual Increament کا بند کرنا اور دور دور علاقوں کو تبدیل کرنا۔ لہٰذا آفیسرز صاحبان اپنے ماتحت ورکروں کی اصلاح بھی کریں اور مفید اور اچھے مشورے دیا کریں۔ صرف مختلف طریقوں سے پریشان نہ کیا کریں۔ ورکروں میں احساس ذمہ داری پیدا کریں اور بتایا جائے کہ ہم قوم و ملک کے ملازم ہیں اور خدمت کرنا ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ ان باتوں سے نئے ایس۔ ای صاحب کو غصہ آیا اور اُنہوں نے کہا کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ پشاور میں یونین

آپ کے لیے مشکلات پیدا کرے گی۔ قصہ کوتاہ ایس ای صاحب نے مختلف طریقوں سے یونین کے عہداروں سے چھیڑ چھاڑ کر دی۔ شب قدر گرڈ سٹیشن کی انسپکشن کی اور مختلف پوائنٹس پر اظہار ناراضگی کیا۔ کچھ ہفتے درمیان میں اس طرح گزرے کہ ایک دن ایک چٹھی کے ذریعے خاکسار کو ہدایت کی کہ تمھارا ہیڈ کوارٹر شبقدر ہے لہٰذا آپ اپنے آپ کو شبقدر شفٹ کریں۔ بندہ نے پہلے ایس ای صاحب کو صورت حال واضح کی ہوئی تھی اور اُنھوں نے مجھے شبقدر میں دفتر اور رہائش کی تعمیر تک شاہی باغ میں رہنے کی اجازت تحریری شکل میں دے رکھی تھی۔ خاکسار نے نئے ایس ای صاحب کو جواب کے ساتھ پہلے والے ایس ای صاحب کی چٹھی آگاہ کیا جس کا انہوں نے بُرا منایا اور میرے جواب اپنی چھٹی کے ساتھ چیف انجینئر صاحب کو بھجوا کر مزید کاروائی کا مشورہ مانگا۔ اللہ رب عزت کی شان دُعاؤں کا نتیجہ کہ کچھ ہی دنوں میں ایس ای صاحب کو واپڈا ہاؤس لاہور سے آرڈر ملا کہ تمھارا تبادلہ سکھر سے پشاور غلطی سے ہو گیا ہے۔ لہٰذا آپ واپس سکھر جائیں۔ ایس ای صاحب کو پسینہ آ گیا ہے کہ دو ماہ ہو گئے ہیں سکھر سے آ چکا ہوں پشاور میں چارج لیا ہے کام چلا رہا ہوں بچوں کو پشاور میں سکولوں اور کالجوں میں داخل کر چکا ہوں۔ اور تبادلہ غلط ہے واپس سکھر کیسے جاؤں لیکن نوکری میں تو ایسے ہوتا رہتا ہے۔ لاہور پہنچے دو ہفتوں تک پریشان اور ذلیل ہوتے رہے اور بڑی مشکل سے اپنے آپ کو پشاور میں رکوایا۔ کچھ عرصہ بعد پشاور واپڈا ہاؤس خاکسار کو کام کے لیے آنا پڑا۔ میرے ساتھ ایک پڑوسی دوست بھی تھا ایس ای صاحب سے واپڈا ہاؤس پشاور میں ملاقات ہو گئی کچھ دیر برآمدے میں باتیں ہوئیں بڑے اچھے طریقے سے اور میٹھے انداز میں باتیں ہوئیں اور اُنہوں نے کیے گئے رویے پر معذرت کی اور مجھے مع دوست کے دفتر میں بیٹھنے کو کہا۔ پھر چائے آ گئی۔ اور انہوں نے کہا کہ مجھے دفتر کے ایک سینئر اہل کار نے بتایا کہ تمھارا والد صاحب اللہ والے ہیں میری طرف سے اپنے والد صاحب سے گذارش کریں مجھ سے غلطی ہوئی تھی اور معذرت خواہ ہوں۔

قبلہ پیر صاحب مرحوم نہ صرف ایک اعلیٰ پائے کے عالم دین تھے بلکہ باعمل شخصیت تھے۔ مسافروں، غریبوں اور حاجت مندوں کے لیے اُن کا دروازہ بفضل تعالیٰ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ ہمارے

گاؤں لکھڑ تحصیل فتح جنگ ضلع اٹک میں واقع ہے ہمارے گاؤں میں تین مساجد ہیں لیکن ہمارے محلے کی مسجد میں قبلہ پیر صاحب امامت اور خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اور یہی مسجد ہر مسافر کے لیے دن رات کُھلی اور آباد رہتی تھی۔ باقی دونوں مساجد شام کے وقت بند ہو جاتی تھیں تو اکثر مسافروں کا قیام رات کو اسی مسجد میں ہوا کرتا تھا تین چار افراد کا رات کا کھانا، صبح کا ناشتہ اور موسم کے مطابق بستروں کا بندوبست پیر صاحب مرحوم کے گھر سے ہوتا تھا۔ گاؤں کے اور علاقے کے چھوٹی بیماریوں والے لوگوں کو دیکھنا اور اُنہیں اپنے گھر میں تیار دائیاں بلا قیمت فی سبیل اللہ دینا بھی پیر صاحب کا ایک طریقہ تھا۔

پیر صاحب کی ہر ایک سے شفقت، محبت اور ہمدردی ایک ضرب المثل تھی۔ ایک عالم باعمل کی حیثیت سے اُنہوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کی جو کسی کی دل آزاری کا باعث بنی ہو۔ گاؤں میں چونکہ فقہ جعفریہ کے افراد بھی تھے اور ہیں۔ لیکن نماز اور روزہ جو ارکان دین ہیں۔ کی پابندی، احترام اور اہتمام میں کمزور اور لاپرواہ تھے۔ لہٰذا جمعۃ المبارک کے دن اپنی تقریر میں بلاخوف و خطر بڑے اچھے اور بہترین انداز میں شیعہ حضرات کو بھی اس غلطی کا احساس دلایا کرتے تھے کہ امام حسین علیہ السلام تو کربلا کے میدان میں بھوکے پیاسے رہ کر اور پنے بچوں، بھتیجوں کو بھی اس وقت میں قربان کیا۔ اور خود بھی یزیدی فوج سے کہا کہ مجھے نماز پڑھ لینے دو پھر جو کچھ آپ لوگوں نے کرنا میرے ساتھ کرو۔ چنانچہ آپ نے شیعہ حضرات کو قائل کیا اور اُنہوں نے تسلیم کیا اور اپنے عقیدے اور مسلک کے مطابق ویران مسجد کو آباد کیا۔ امام مقرر کیا اور نماز روزے کا اجراء بھی ہوا۔ عام علما اور آئمہ مساجد اپنے پیروکاروں کو صلح و آشتی کی فضا قائم کرنے کی بجائے مسالک میں جذباتی اور مخالفانہ فضا پیدا کرنے میں اپنی بہتری اور عافیت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اللہ رب العزت کا فرمان عالی شان ہے۔ **واعتصمو بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقو**۔ جس کے لیے قبلہ پیر صاحب نے عمل کیا۔ اور کوشش کی عقائد اور مسالک کے اختلاف کو انتشار اور اختلاف کی نذر نہ کیا جائے۔ ایسے جہاندیدہ اور زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھنے والوں کے لیے شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

رمضان شریف کا مہینہ تھا، گرمیوں کا موسم تھا۔ پیر صاحب مرحوم گاؤں سے باہر کسی سے ملنے گئے تھے۔ اس دوران ہمارے گاؤں گکھڑ سے دور ایک مقام جسے جھگی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور کالا چٹا پہاڑ میں واقع ہے سے ایک شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا گھر میں ہمارے ایک رشتہ دار جو لکی مروت سے آئے ہوئے تھے۔ وہ باہر نکلے اور پوچھنے پر بتایا کہ جب پیر صاحب واپس آئیں تو اُنہیں بتائیں کہ فلاں شخص جھگی والا فوت ہو گیا ہے اور مرحوم نے وصیت میں کہا ہے۔ ''اُس کا جنازہ پیر صاحب پڑھائیں''۔ کچھ دیر بعد جب پیر صاحب واپس تشریف لائے تو مہمان اور گھر والوں نے بتایا کہ واقع رونما ہوا ہے۔ روزہ ،گرمی اور آپ ابھی روزہ اور گرمی میں پسینہ میں شرابور ہیں ''سبحان اللہ'' فرمایا اگر مرنے والا اور جنازے میں شمولیت کی وصیت کرنے والا اور دعوت دینے والا زندہ ہوتا تو شائد میں نہ پہنچ پاتا لیکن چونکہ وہ وصیت کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاں چلا گیا ہے۔ اور مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کہے کہ اس نے میرا جنازہ نہیں پڑھایا۔ تو ''قہار و جبار'' خدا مجھ سے پوچھے گا۔ اور میرے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہوگا یہ کہہ کر روزہ اور گرمی کی شدت میں تھوڑی دیر بیٹھے اور چل پڑے۔ اور قریباً 5-6 میل کا پیدل سفر طے کر کے وہاں پہنچے اور جنازہ پڑھایا۔

قارئین! ان الفاظ کو دُہرانا ضروری اس لیے سمجھا کہ آج کے دور میں ایک زندہ انسان دوسرے زندہ انسان سے وعدہ کر کے بھول جاتا ہے نظر انداز کر دیتا ہے یا کوئی مجبوری ظاہر کر کے وقت گزار دیتا ہے۔ لیکن پیر صاحب مرحوم ایسا نہ کر سکے۔ اُنہوں نے مرنے والے کی وصیت اور خواہش کا احترام کیا۔ اب دُعا ہے کہ بطفیل سرکار مدینہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مرحوم مسلمانوں کے بمع پیر صاحب جنت الفردوس میں درجات بلند کرے۔ آمین یا رب العالمین۔ علاقے میں دور دور تک کسی کی وفات کا پتہ چلتا تو وہ مرحوم کے لیے تعزیت کرنے جاتے۔ پیر صاحب مرحوم ایک ایسا گوہر نایاب تھے جو حکیم بھی تھے، معاملہ فہم، صلح کن طبیعت کے مالک اور سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے ایک جہاندیدہ

شخصیت تھے۔ گاؤں کے کرتا دھرتا خوانین سے مل کر کالا چٹا پہاڑ میں ''پناں والی بن'' سے لے کر گکھڑ تک سڑک کے لیے درخواست دی حکومتی ذمہ داران نے جواب دیا کہ اپنی مدد آپ کے تحت گاؤں کے لوگ بھی کام کریں۔ جس پر پیر صاحب نے اپنے رفقاء اور محلے کے لوگوں کو خوانین نے اپنے زیر اثر لوگوں کو اس کارِ خیر کو بفضل تعالیٰ کامیابی اور خوش اسلوبی سے مکمل کیا۔ وہی سڑک گکھڑ سے باہتر تک آج آمدورفت کے لیے زیر استعمال ہے۔ الحمدللہ خود کام میں دلچسپی لینا اور اپنے پیر کاروں کو ذہنی طور پر قائل کرنا اگرچہ مشکل کام ہے جو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں اللہ ان کی رہنمائی فرماتا ہے اور کام کو آسان کر دیتا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور جیسے وہ ذات اقدس پورا کرتی ہے۔

''لاتخلف المیعاد'' (القرآن)

اب ذرا ایک ایسی بات جو نہ ضبط تحریر میں لائی جا سکی اور نہ زبان سے نکالی جا سکی۔ عمر کے اس حصے میں جب خاکسار گناہ آلودہ زندگی کے 75 سال (اکتوبر 39 تا فروری 2014ء پوری کر چکا ہے)۔ ہم دونوں بھائی یعنی محترم برادرِ بزرگ محمد حسین شاہ مرحوم اور خاکسار قربان حسین شاہ قبلہ والد محترم صاحب کو حج مبارک کے لیے رخصت کرنے اُن کے ساتھ صبح سویرے باہتر جا رہے تھے۔ اُس وقت سڑک کا نام ونشان نہیں تھا جب ہم نے دریائے نندنہ پار کیا۔ تو قریباً آدھ فرلانگ بعد ایک چھوٹا سا نالہ آتا ہے اور پھر ایک چڑھائی ہے نالے سے نکل کر چڑھائی کے شروع میں ایک مرد اور ایک عورت مع دو تین بچوں کے بیٹھے ہیں۔ پیر صاحب نے اُنہیں سلام کیا اور مرد نے کھڑے ہو کر اور جھک کر سلام کا جواب دیا اور ملا۔ مزید بات چیت نہیں ہوئی خاکسار تو دل میں ڈر گیا اور بڑے برادرِ محترم محمد حسین شاہ مرحوم تو ڈر کے لفظ سے بھی ناآشنا تھے وہ تو بقول شاعر ''مصیبت سے اُلجھ کر مسکرانا میری عادت ہے'' کچھ دیر آگے پہنچے تو برادر محترم نے والد صاحب سے پوچھا۔ کہ یہ شخص کون تھا مجھے تو ''جن'' لگ رہا تھا۔ والد صاحب نے فرمایا تم کیا کرتے ہو؟ فقیر نے سلام کیا اور اُس نے جواب دیا۔ اور مصافحہ کیا احترام سے ملا مسلمان تھا اُس نے حج پر جانے کا اور ملنے کا مناسب اور موزوں جگہ کا انتخاب کیا۔ جہاں عام لوگوں کے سامنے ملنا

اس کے لیے مشکل تھا اور بس۔ اُس دن لنگر سے برادرم محمد اکرم شاہ مرحوم بھی قبلہ والدم صاحب کو رخصت کرنے آیا تھا لنگر اور باہتر کے مقامی لوگ بھی ان حاجی صاحبان کو رخصت کرنے کے لیے باہتر اڈہ پر موجود تھے۔ باہتر مڈل سکول تھا اُس کے تمام اساتذہ بھی اس ارادے سے موجود تھے کہ بیت اللہ شریف اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری دیتے وقت انہیں بھی دُعاؤں میں یاد رکھا جائے اُن میں بابا حاجی فضل الٰہی اپر باہتر، سید رحم دریا شاہ، سید فضل حسین شاہ اور مڈل سکول باہتر کے ہیڈ ماسٹر جناب امیر داد میر بھی گونج اور چمک کے ساتھ اس مجمع کو چمکائے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام لوگوں کو مغفرت نصیب فرمائے۔ جوان حاجیوں کو رخصت کرنے اور دل میں دُعاؤں کی خواہش اور تمنا لیے ہوئے آئے تھے۔ آمین۔ حاجی صاحبان کو بس میں بٹھا کر سب حضرات رخصت ہو گئے اور ہم تینوں بھائی واپس اپنے اپنے گاؤں چل دیئے۔ دوسرے دن جب سکول گئے تو کلاس انچارج جو ہیڈ ماسٹر صاحب کا بیٹا تھا گذشتہ دن کی غیر حاضری کے سبب جو لڑکے غیر حاضر تھے ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے پیش کیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بڑی حیرت سے کلاس انچارج ارشاد حسین کو کہا کہ کیوں اُستاد ان کا کیا قصور ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ دونوں بھائی کل غیر حاضر تھے۔ تو انہوں نے کہا ارشاد بڑے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ کل ان کا والد آقائے نامدار کے وطن حج کو روانہ ہوا ہے اور تمہارا والد اس نعمت اور عزت سے محروم ہے کیا تم مجھے سرکار دو عالم ﷺ کے سامنے قیامت کے دن شرمسار کرنا چاہتے ہو کہ حج پر جانے والے شخص کے بچوں کو سزا دوں ذرا سوچو اور خدا سے معافی مانگو اور ہمیں فرمایا کہ جاؤ بیٹا اپنی کلاس میں سبق پڑھو اور پیر صاحب کی واپسی تک اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہہ سکتے ہو اور برادر بزرگ سید محمد حسین شاہ کو کہا کہ چھوٹے بھائیوں کا خیال کرو۔

جیسا کہ گذشتہ صفحوں میں قبلہ پیر صاحب کا گکھڑ کو آنیوالی سڑک کی تعمیر کے کام اور اس میں نمایاں کارکردگی اور دلچسپی کا ذکر کیا گیا ہے یہاں باہتر کے مڈل سکول کو ہائی سکول کا درجہ دلوانے کا وقت اور ذکر خیر کر دینا بھی ایک خراج عقیدت ہے اور دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام صاحبان کی روحوں پر رحم کرے اور اُن کے درجات بلند کرے۔ اُس وقت پنجاب بھر کے تعلیمی ادارے یعنی پرائمری، مڈل اور ہائی سکول

ڈسٹرکٹ بورڈ کے تحت ہوا کرتے تھے۔ اور اساتذہ کرام بڑی مشکلات اور پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ اُن کی مراعات صرف تنخواہوں تک محدود تھیں۔ نہ جی پی فنڈ کی کٹوتی۔ نہ ای۔ پی فنڈ بس عمر پوری ہوئی تو بغیر کسی امدادی فنڈ کی ادائیگی۔ اُستاد دو ہاتھ دو پاؤں واپس اپنے گھر کو چلا جاتا تھا کوئی گریجویٹی، یا پینشن نہیں۔ اساتذہ اکثر اوقات ہڑتال جب انتہائی قدم اُٹھا کر تنخواہ وصول کرتے تھے تو ان حالات میں اٹک ڈسٹرکٹ بورڈ نے اٹک میں چار مڈل سکول جن میں باہتر، بسال، ٹمن، لاوہ کو ہائی سکول کا درجہ دینے کا فیصلہ اس شرط پر کیا کہ علاقے کے لوگ اپنے سکول کے لیے دس، دس ہزار روپے جمع کروائیں تا کہ ان سکولوں کو ہائی سکول کا درجہ دیا جا سکے۔

یہ 55-1954ء کی بات ہے۔ خاکسار اُس وقت آٹھویں جماعت میں زیر تعلیم تھا جب اللہ تعالیٰ مہربان ہو جائے تو منزلیں آسان ہو جایا کرتی ہیں اور لوگ جدوجہد پر کمربستہ ہو جایا کرتے ہیں۔ مڈل سکول باہتر میں کچھ اساتذہ دماغ اور سوچ کے مالک تھے جو سر سید احمد خان کے تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے کا جذبہ اور جنون دل و دماغ میں رکھتے تھے۔ اُن میں سید رحم دریا شاہ، سید مزمل شاہ اور سید فضل حسین شاہ سب سے آگے تھے اور اُنہوں نے سکول سٹاف سے مشورہ کر کے تجاویز اور طریق کار وضع کیا۔ اور قرعہ سید رحم دریا شاہ جو شکل وصورت، قد کاٹھ اور اپنی شخصیت کا جادو کرنا جانتے تھے۔ چندہ اکٹھا کرنے کا اُن کے ذمے کیا گیا وہ روزانہ سکول سے چھٹی کر کے سکول کے بچوں کے ساتھ اُن کے گاؤں جاتے تھے اور رات کو گاؤں میں پھر کر چندہ اکھٹے کرتے تھے ار دوسرے دن اُنہی بچوں کے ساتھ واپس سکول میں حاضری کرتے۔ اور اسمبلی کی کاروائی کے بعد چندہ دینے والے ہر شخص کا نام اور دی گئی رقم اور پھر ٹوٹل بتاتے۔ یہ رحم دریا شاہ کی دریا دلی تھی۔ پھر بات یہاں تک پہنچی کہ ہمارے گاؤں گکھڑ کا نمبر آ گیا۔ رات کو شاہ صاحب کے ساتھ قبلہ والدم صاحب سید محمد علی شاہ صاحب گلی گلی پھرے اور چندہ اکٹھا کیا۔

یاد رہے اُس وقت کے دس ہزار اور آج کے دس لاکھ سے بھی زیادہ قیمتی اور مشکل تھے۔ شاہ صاحب مرحوم نے کچھ گاؤں اور کچھ حضرات سے دوسرا چکر لگا کر اس کارِ خیر کو مکمل کرنیکا عہد کر رکھا تھا۔

قبلہ والدم صاحب اور کچھ دوسرے اللہ کے نیک بندوں نے دو دو تین تین دفعہ چندہ دیا۔ اور ہمارے گاؤں والے لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ اُنہوں نے اس سلسلے میں مہمان نوازی کی اللہ تعالیٰ اس کارخیر میں حصے لینے والوں کو جزائے خیر سے نوازے۔ کہتے ہیں۔ ''کہ نیکی کر دریا میں ڈال'' لیکن الحمدللہ اور اُس رب ذوالجلال کا شکر کس طرح ادا کروں؟ اس موقع پر لکھنے سے پہلے اور اب تک مجھے کوئی ایسا طریقہ معلوم نہیں ہوا کہ اللہ کا شکر کن الفاظ اور طریقے سے ادا کروں۔ کہ خاکسار کا گکھڑ پرائمری سکول سے باہتر سنٹر سے امتحان پاس کیا۔ اور اس امتحان پاس کرنے سے پہلے پوری تحصیل فتح جنگ کے پرائمری سکول کی چوتھی جماعت کے طالبعلم فتح جنگ میں مقابلے کے امتحان میں شمولیت کرتے تھے اور پھر وہ امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد انہوں/4 روپے ماہوار وظیفہ دیا جاتا تھا۔ ہمارے گکھڑ سکول میں دو اساتذہ سید لال شاہ مرحوم جو باہتر کے رہائشی تھے اور دوسرا وارث خان مرحوم جو گکھڑ کے باسی تھے۔ ان دونوں نے اس سکول کے بچوں کے ساتھ پوری پوری محنت کی اور اُستاد کا حق ادا کیا۔ جس پر یہ گنہگار اُن کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا سوالی ہے کہ خاکسار بھی اس وظیفے کا حقدار ٹھہرا۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اساتذہ کو تین تین اور چار چار ماہ بعد تنخواہ ملتی تھی تو بندہ مڈل کا امتحان دیکر گھر میں مستقبل سے بے فکر وقت گزار رہا تھا۔ کہ باہتر سکول میں پڑھنے والے میرے چھوٹے بھائی سید مشتاق حسین شاہ نے بتایا کہ آپکا وظیفہ آیا ہوا ہے۔ اور کل یا پرسوں جا کر وصول کریں۔ یہ چار ماہ کا وظیفہ تھا اور 16 روپے تھے کیا بات ہے کل سولہ روپے ملیں گے کل باہتر جانا ہے وظیفہ لینا ہے کپڑے تیار ہوئے دل میں مٹھائی خریدنی اور گھر میں لانے کی خواہش آپ کیا جانیں یہ کوئی نہ پوچھے بہر حال دوسرے دن سکول پہنچا۔ متعلقہ استاد ماسٹر محمد حسین صاحب جولنگر سے تھے وظیفہ لینے کے لیے اُنہیں رجسٹر پر دستخط کر دیئے اور وظیفہ کا طلبگار رہا جواب ملا۔ رحم دریا شاہ صاحب سے ملیں وہاں حاضر ہوا اُنہوں نے فرمایا وہ ہم نے سکول کے چندے کے لیے وصول کر لیے ہیں خاکسار کی نظر شاہ صاحب کے مقابلے میں اتنی دور نہیں لگتی تھی سو میں نے عرض کہ جناب ہم تو دو تین دفعہ سکول کے لیے چندہ دے چکے ہیں۔ شاہ صاحب نے

فرمایا تم میری بات کو نہیں سمجھ سکے جناب پیر صاحب کو میرا اسلام عرض کرنا اور وہ تمہیں بتادیں گے۔ یہی بات خاکسار نے والدم صاحب بزرگوار سے جو کہی تو فرمانے لگے یہ بات اُستاد اور شاگرد کے درمیان کا معاملہ ہے جو کچھ رحم دریا شاہ صاحب نے کہا وہ صحیح ہے تم نے آٹھویں کا امتحان دیا ہے اور نہم میں داخلہ لو گے سکول کے لیے سارے علاقے بلکہ دور دراز سے چندہ اکٹھا کیا جا رہا ہے خدا رحم دریا کی اس جدوجہد کو کامیاب کرے آمین۔ بہر حال خاکسار کو قبلہ والدم صاحب کے اس جواب سے خوشی اور اطمینان ہوا اور حوصلہ افزائی ہوئی شکر الحمدللہ میں اس سکول کا واحد طالبعلم تھا جس نے اپنے مستقبل کے لیے آج 16 روپے دیئے۔ اللہ رب العزت کا شکر یہ ادا کرتا ہوں جس نے رحم دریا شاہ کو باہتر میں پیدا کیا۔ اور اس علاقے کے ناخواندہ اور غریب عوام کے بچوں کے لیے بے مثال جدوجہد اور کوشش کی اس پر اگر رحم دریا شاہ مرحوم کو اس علاقے کا ''سرسید'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ علاقے کے کچھ بااثر حضرات اور پڑھے لکھے لوگ شاہ رحم مرحوم کو اس کوشش اور جدوجہد کو اُن کے ''خان ازم'' کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ خاکسار نے اسی سکول سے میٹرک کیا۔ واپڈا میں ملازمت کی اور 1999ء میں بطور ایس۔ ڈی۔ او ریٹائر ہوا۔ یہ خدا کا فضل اور اسی سکول کی وجہ سے ممکن ہوا اور اس طرح مجھ جیسے ہزاروں غریبوں کے بچوں نے میٹرک کے بعد ملکی اداروں میں روزگار کر کے اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہوئے ہونگے۔ اسی وجہ سے آج موضع باہتر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

مختصراً عرض کر دینا ضروری ہے کہ علاقے اور خاص کر گاؤں کی سماجی اور اخلاقی وقانونی صورتحال پر پیر صاحب کی پوری نظر رہی ہے اور ہر وہ کام جس سے جس طریقے سے اصلاح ممکن ہو عالی مرتبت پیر صاحب نے اُس میں نمایاں حصہ لیا۔ عمر عزیز کے آخری حصے میں جب آپ علیل تھے اور پشاور میں خاکسار کے ہاں مقیم تھے تو گاؤں کے لوگوں میں بھی بے چینی پیدا ہوئی اور اُن کا پشاور بیمار پرسی کے لیے آنا جانا شروع ہوا خاص کر گاؤں اور محلے کے لوگ جنہوں نے پشاور دیکھا نہیں تھا وہ بیچارے بھول جاتے تھے۔ ایک دفعہ گاؤں کے تین چار عمر رسیدہ پشاور کے لیے بس میں روانہ ہوئے۔ اور غلطی سے پبی

اُتر گئے اور وہاں کے بجلی گھر یعنی گرڈ سٹیشن کے انچارج نے خاکسار کو فون پر بتایا کہ کچھ مہمان جو گکھڑ
سے پیر صاحب کو دیکھنے اور ملنے کے لیے آئے ہیں اور ناواقفیت کی وجہ سے پہی اُتر گئے ہیں میں انہیں
چائے پلا کر ایک آدمی ان کے ساتھ بھیج رہا ہوں تاکہ یہ مزید آپ کے گھر تک آرام اور سہولت سے پہنچ سکیں
گاؤں اور علاقے بھر کے لوگوں کا روزانہ آنا جانا اور قبلہ پیر صاحب سے باتیں کرنا دُعا کرنا اور کروانا روزانہ
ایک میلہ لگتا تھا۔ اسی دوران ہمارے ایک عزیز سید جعفر شاہ جن کا تعلق لنگر سے تھا وہ بھی آئے اللہ اُن کو
جزائے خیر سے نوازے اور قبلہ پیر صاحب سے کہنے لگے کہ آپ یہاں دوائی استعمال کریں اور مکمل آرام
کریں۔ لنگر اور گکھڑ اپنی جگہ پر ہیں جب بالکل ٹھیک ہو جائیں تو پھر آئیں۔ اب گاؤں کی سوچ اور غم دل
سے نکال دیں۔ قبلہ پیر صاحب میری طرف مخاطب ہوئے اور فرمانے لگے کہ قربان حسین روزانہ قریباً
کتنے لوگ آتے ہیں تو خاکسار نے عرض کیا کہ دس اور پندرہ مہربان آتے ہیں۔ تو قبلہ والدم صاحب نے
محترم جعفر شاہ صاحب کو کہا لوگوں نے پشاور شہر کا نام سُنا ہے دیکھا نہیں ہے پشاور کی جگہ کوئی پہی میں اُتر
جاتا ہے کوئی اکبر پورے میں تو کوئی ناصر پورہ اور چغل پورہ میں اُتر جاتا ہے اور پھر پشاور یعنی خاکسار کی
رہائش تک پہنچتا ہے۔ اور زبان کا بھی مسئلہ ہے جو مہربان اتنی تکلیف کر کے پشاور آئیں میں اُنہیں کیوں
بُھلاؤں اور کیسے بھلاؤں۔ چونکہ خاکسار طویل عرصے سے ملازمت کے سلسلے میں پشاور میں مقیم تھا مزید
براں واپڈا کو یونین میں ایک اہم عہدہ پر بھی فائز تھا اور ورکروں کی خدا کے فضل سے خدمت میں پیش پیش
رہا اور اس سلسلے میں کئی غیر ممالک کے دورے بھی کیے۔ گذارش کا مطلب اور مقصد یہ کہ نہ صرف گکھڑ
لنگر، باہتر، جھنگ پیر وشاہی کے لوگ بلکہ پشاور، چارسدہ اور شب قدر بلکہ کوہاٹ، نوشہرہ وغیرہ کے واپڈا
کے ورکر ملازمین کا آنا جانا اور والدم صاحب کی بیمار پُرسی جو میرے لیے حوصلہ افزائی اور اطمینان بخش تھا۔

1947ء میں جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب سرکار مدینہ راحت قلب وسینہ کے طفیل
برصغیر ہندو پاک کے مسلمانوں پر رحم فرمایا اور مملکت خداداد پاکستان دُنیا کے نقشے پر وجود میں آیا۔ آبادی
کے انتقال نتیجے کے طور پر ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا وہ قتل عام کیا۔ بلکہ ناقابل بیان اور

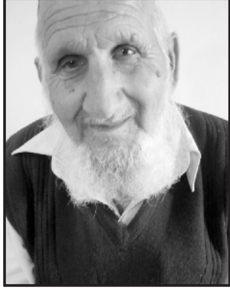
ناقابل تحریر مظالم کیے اور ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنیوالے مسلمان مردوں اور خواتین کا قتل
عام کیا بلکہ خواتین کی عزت بھی لوٹی گئی۔ جب یہ خبر اور لاشیں پاکستان یعنی لاہور پہنچیں تو یہاں کے
مسلمانوں نے بھی انتقامی جذبے کے تحت متاثرہ ہندوؤں کی بھی پکڑ دھکڑ لوٹ مار کی۔ ہمارے گاؤں
گکھڑ تحصیل فتح جنگ کے سارے مواضعات میں بھی سخت ردعمل ہوا قتل مقاتلہ تو نہیں ہوا لیکن ہندوؤں
کے جو کاروباری لوگ تھے اُن کی دُوکانوں اور گھروں کو لوٹا گیا۔ نتیجے کے طور پر پولیس کو گرفتاریاں کرنی
پڑیں جو لوگ پولیس کے آنے پر ادھر اُدھر ہو جاتے تھے چند دن بعد پولیس نے فوج سے امداد طلب کی
اور رات کو فوج نے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا۔ جب عام لوگ جاگے تو فوج نے لوگوں کو گاؤں سے
نکلنے سے روک لیا اور آہستہ آہستہ گھروں کی تلاشی شروع کر دی اور بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ لیکن
جب فوجی اور پولیس والے ہمارے گھر کی تلاشی کے لیے آگے بڑھے تو ہندو گھرانے جو فوج کے ساتھ
تھے اُنہوں نے کہا کہ پیر صاحب پر ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی گلہ ہے مطلب یہ پورے
گاؤں میں صرف ہمارا گھر تلاشی سے بچ گیا۔ یہ قبلہ پیر صاحب مرحوم کی خدا اور رسول ﷺ کے احکامات
کی پابندی کا نتیجہ تھا کیونکہ پیر صاحب نے بفضل تعالیٰ ساری عمر ''قال اللہ وقال الرسول'' کے مطابق
زندگی گزاری تھی۔ بدیں وجہ نہ صرف گاؤں بلکہ علاقہ ہٰذا میں ایک واحد مثال ہے کہ گاؤں کے تمام
ہندوؤں کو لُوٹا گیا فوج اور پولیس اور ہندوؤں کے ساتھ اس گاؤں کے تمام گھروں کی تلاشی لی گئی۔ اور پیر
صاحب مرحوم کی پاکدامنی کی وجہ سے صرف اس گھر کی تلاشی سے نظر انداز کیا گیا۔ الحمدللہ...... ایک دفعہ
قبلہ پیر صاحب علاقہ لکی مروت سے واپس اپنے گاؤں تشریف لا رہے تھے اور فتح جنگ بس اڈے پر
اُترے پیر صاحب کے پاس ایک بڑے بیگ میں کچھ سامان تھا اُس وقت فتح جنگ اور اٹک کے درمیان
سڑک نہیں تھی۔ بدیں وجہ عالی مرتبت پیر صاحب فتح جنگ سے پیدل راستے پر عازم گکھڑ ہوئے کہ
راستے میں ایک جگہ رفع حاجت کے لیے سامان ایک طرف رکھا اور جب فارغ ہوئے تو دیکھا کہ سامان
غائب ہے اسی گاؤں کا ایک شخص جس کا نام بھولا ہوا ہے اُسے دیکھا اور اُس سے پوچھا کہ یہاں پر میں

نے کچھ سامان رکھا تھا۔ وہ سامان چونکہ اُس شخص نے اُٹھایا تھا لہٰذا وہ جواب میں لڑکھڑا گیا۔ پیر صاحب نے اُسے کہا کہ اس سامان میں میرا قرآن پاک اور ایک دوا اور دینی کتابیں تھیں یہ قرآن پاک اور کتابیں تمھارے کام کی نہیں ہیں اور بہتر ہوگا کہ یہ واپس کردو۔ اُس نے پریشانی کی حالت میں جواب دیا کہ جناب یہ کام میں نے نہیں کیا کسی اور نے یہ کام کیا ہوگا۔ خیر پیر صاحب بغیر مزید بات چیت کیے اپنے گھر کو چل دیئے۔ دوسرے دن علی الصبح وہ شخص وہی سامان مکمل بند لا کر ہمارے گھر پر آ کر دستک دی اور کہا کہ یہ سامان کسی دوسرے آدمی نے اُٹھایا تھا جسے میں جانتا ہوں اور اُس نے مجھے دیدیا ہے آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں میں معافی کا خواستگار ہوں اور مجھے معاف کردیں اور میرے لیے دُعا کریں کہ خدا تمہیں معاف کرے کہ میرا سامان تم وہاں سے اُٹھا کر لائے ہو اور پورا سامان لائے ہو۔ اس لیے تم دُعا کے مستحق ہو سو گذارش کا مطلب یہ ہے کہ پیر صاحب کے منہ سے خدا کے فضل سے کبھی کسی کے لیے سخت الفاظ نہیں نکلے اور یہی وجہ تھی کہ قبلہ پیر صاحب کے متعلق علاقے کے کسی شخص کے منہ سے گلہ شکوہ نہیں سُنا گیا۔ اور پیر صاحب کی وجہ سے آج تک اُن کے صاحبزادوں کے لیے علاقے کے لوگوں کے دلوں میں عزت اور اُونچا مقام ہے۔

اللہ تعالیٰ سے اُن کے صاحبزادے دست بدُعا ہیں کہ قبلہ پیر صاحب کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

(آمین)

__☆☆____☆☆____☆☆__



بزرگوارم محمد علی شاہ مرحوم و مغفور

سید محمد جُنید شاہ

آپ رشتے میں پیر صاحب مرحوم کے داماد اور خاندانی لحاظ سے قریبی کزن ہیں۔فوج میں طویل ملازمت کے بعد بطور اعزازی کیپٹن ریٹائر ہوئے۔ مطالعہ کتب بہت زیادہ ہے۔ لیکن کبھی کوئی باقاعدہ تحریر نہیں لکھی۔ اُن کی زندگی سادگی ، پارسائی اور تقویٰ کا مجموعہ ہے۔

بزرگوارم محمد علی شاہ مرحوم و مغفور ایک مُدبر اور ذہین انسان تھے۔ اُن کے بارے میں یادداشتوں کا اس وقت تحریر میں لانا بہت کٹھن مسئلہ ہے۔ تاہم میری یادداشت کے مطابق اُنہوں نے 1912ء تک موضع ''بٹھو''، تحصیل فتح جنگ کے ایک دینی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ میرے ایک چچا سلطان شاہ مرحوم نے بھی اُن کے ساتھ ہی دینی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ یعنی میرے چچا جنگ عظیم اول 1914-18ء کے دوران 5 سال تک افریقہ میں رہے۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد گھر کو چھٹی پر آئے۔ جس دن واپسی تھی۔ اُسی دن گھر میں فوت ہو گئے۔ جبل پُور (بھارت) کی چھاؤنی میں اُن کی یونٹ تعینات تھی۔ لہٰذا مرحوم کے چند ساتھی جو کہ ''انجرہ''، تحصیل جنڈ ضلع اٹک کے رہنے والے تھے۔ وہ واپس چھٹی کاٹ کر جا رہے تھے۔ کہ فتح جنگ ریلوے سٹیشن پر چچا صاحب مرحوم کی فوتیدگی کی اطلاع دینے کے لیے لالہ جی صاحب مرحوم خود گئے۔ اور اُن کو بیماری کی پوری تفصیل بتائی۔

مرحوم اپنی خداداد دینی و دُنیاوی صلاحتیوں کے سبب علاقہ کے لوگوں کے درمیان فیصلے بڑی دانش مندی سے کرتے تھے یہاں تک کہ علاقہ ضلع بنوں (لکی مروت) تک کے لوگوں کے درمیان ہر قسم کے تنازعات کے بارے میں فیصلے بڑی دانش مندی سے کرتے تھے۔ جو کہ اب تک لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک بات یاد پڑتی ہے۔ کہ زندگی کے آخری ایام میں موضع خواجہ خیل (اب

ضلع لکی مروت) کے چند معتبر آدمی جو کہ سابق صدر غلام اسحٰق مرحوم کے قریبی رشتہ دار تھے آپ کے پاس پشاور میں آئے۔ اور اپنی ایک جائیداد کے تنازعہ کے بارے میں جو کہ 30-1929ء میں اُنکے بزرگوں نے ہی آپ سے فیصلہ کرایا تھا۔ اُسکی تصدیق کے لیے آئے۔

ذہنی طور پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑا بلند مقام عطا کیا تھا۔ آپ کی وفات سے دو دن قبل اُن سے پشاور کو ملاقات کے لیے گیا۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ میرا آئندہ سال 1986ء میں حج پر جانے کا پروگرام ہے۔ وہ بڑے خوش ہوئے۔ اور پھر مجھے حج کے ارکان تفصیل سے بتانے شروع کئے۔ کافی دیر تک تمام حج کے ارکان کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی جس سے میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا حالانکہ وہ وقت اُن کی علالت کی وجہ سے زیادہ باتیں کرنے کا بھی نہ تھا۔

دینی تعلیم کے بارے میں اُن کا ایک منفرد مقام تھا۔ آپ کو عربی و فارسی زبانوں پر پورا عبور حاصل تھا۔ اپنے گاؤں موضع گکھڑ میں کوئی کسی قسم کا تنازعہ کھڑا ہوتا۔ تو اس کا فیصلہ کتاب وسنت کے مطابق کرتے۔ اور لوگ آپ کے فیصلہ کو من وعن تسلیم کرتے۔ اور اس میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ تمام مسلک کے لوگ آپ کا انتہائی عزت واحترام کرتے یہاں تک کہ اگر آپ کو کسی بڑے جرگہ میں بُلایا جاتا تو حجروں میں رکھے ہوئے حُقے چھُپا دیئے جاتے۔ اور سگریٹ پینے والے اپنی سگریٹ کو پاؤں میں دبا کر چل دیتے۔ جرگہ کے درمیان جب تک آپ تشریف رکھتے تو لوگ انتہائی عزت واحترام سے بات چیت کرتے اور اپنے سر کو ٹوپی یا پگڑی سے ڈھانپ کر رکھتے۔

جس دن پاکستان کی آزادی کا اعلان ہوا۔ تو اُس وقت گکھڑ میں ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں پر ظلم وستم کی داستانیں سُن کر گکھڑ کے لوگ بھی طیش میں آ گئے۔ ہندو اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور گاؤں کے لوگوں نے لُوٹ مار شروع کر دی۔ یہاں تک کہ گھروں اور دُکانوں میں رکھے ہوئے سامان کو بھی نہ بخشا گیا اور سامان اُٹھا کر گھروں کو لے گئے۔ چند دن بعد پولیس کی ایک بھاری نفری گاؤں میں آئی۔ اور گھر گھر تلاشی شروع کی دی۔ مرد حضرات گھروں کو چھوڑ کر

قریب کے پہاڑوں میں چھپ گئے۔ خواتین گھروں میں محصور رہیں۔ کچھ سامان پولیس نے گھروں سے نکلوایا۔ جب پولیس بزرگوارم لالہ جی صاحب کے گھر کے پاس آئی پولیس کے ساتھ گاؤں کے ہندو بھی تھے سو ہندوؤں نے پولیس کو کہا کہ پیر صاحب نے ہمارے گھر اور سامان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا لہٰذا پولیس بغیر تلاشی کے واپس چلی گئی۔ گاؤں کے بہت سارے لوگ لوٹ مار میں شریک تھے۔ پولیس اُن کو گرفتار کرنے کے لیے آئی۔ لیکن وہ پہاڑوں میں چھپ جاتے۔ اور سارا سارا دن موسم گرما میں پہاڑوں میں ہی گزارتے اور یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا۔

ذہانت کے علاوہ صحت کے لحاظ سے بھی اگر دیکھا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو بڑی اچھی صحت سے نوازا تھا۔ آپ حکمت بھی کرتے تھے۔ اور ادویات تیار کر کے بیماروں کو مفت تقسیم کرتے تھے۔

آپ نے ایک دفعہ بتایا کہ میرے والد صاحب میاں گل شاہ مرحوم بیمار ہو گئے۔ میں موضع لنگر سے دوائی لینے کے لیے مارچ 1917ء میں ''حضرو'' میں مقیم ایک ہندو حکیم کے پاس پیدل گیا۔ گھر سے سورج نکلتے ہی روانہ ہوا۔ اور ظہر کی نماز ''حضرو'' میں ہی ادا کی۔ حکیم نے کہا کہ نماز پڑھ آئیں۔ اتنے تک دوا تیار ہو جائے گی، نماز سے فارغ ہو کر حکیم سے دوائی لی۔ اور گھر کو واپس آئے۔ عصر کی اذان ہوئی۔ اُس وقت آپ لنگر گاؤں کے شمالی قبرستان تک پہنچ گئے۔

ایک دوسرے واقعہ میں آپ نے بتایا کہ میری والدہ ماجدہ محترمہ بی بی فیروز خانم بیمار ہو گئیں۔ آپ پیدل اُن کے لیے دوائی لینے کے ''چوہڑ پال'' (راولپنڈی) دسمبر 1925ء کو ایک حکیم کے پاس گئے۔ گھر سے صبح سویرے روانہ ہوئے دوائی لے کر واپس گھر آئے۔ کہ گھر کے دروازہ کے باہر پہنچے ہی تھے کہ بیمار والدہ مرحومہ نے پوچھا۔ کہ ابھی میرا بیٹا واپس نہیں آیا ہے کہ اتنے میں ڈیوڑھی کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ مرحومہ نے دلی دُعائیں دیں جن دُعاوں کا ثمر آخری عمر تک پاتے رہے۔

☆☆ ☆☆ ☆☆

جناب والد محترم مرحوم کے بارے میں ان کی اکلوتی دختر

محترمہ شہناز بی بی کی یادداشتیں

والدم صاحب مرحوم سے اپنے عقیدت مند دُعائیں کرواتے تھے اور وہ اکثر حاجت مندوں کو بڑے اعتماد سے حسب درخواست اور حسب حاجت دُعا فرماتے۔

وہ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے بیٹھے بیٹھے ذکر فرمایا کہ ہمارے بزرگوں (اُن کے والد سید میاں گل شاہ) نے حج ادا فرمایا تو واپسی پر دعا کی کہ یا اللہ میرے بیٹے کو بھی حج کی توفیق عطا فرما تو آپ نے پہلی مرتبہ 1950 میں حج کی سعادت حاصل کی اور دوسری مرتبہ اپنے برخوردار سید حمید شاہ کی دعوت پر (جو اُس وقت سعودی عرب میں فوج کی ملازمت میں تھے) حج پر تشریف لے گئے۔ اور اُس سعادت کو اپنے والد کی دعاؤں کا اثر قرار دیا۔ اس موقع پر انہوں نے فرمایا کہ میں بھی اپنے بیٹوں کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو حج کعبہ کی سعادت نصیب کرے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ ہمارے تمام بھائیوں اور بہن کو ماشاء اللہ نوجوانی میں حج اور عمرے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔

والدین کی اطاعت اور اُن سے محبت (ہمشیرہ کے حوالے سے):

ہمارے والد بزرگوار ہر اچھے اور نیک انسان کی طرح اپنے والدین سے شدید محبت کرتے تھے اور اُن کی اطاعت میں کوئی دقیقہ فروگزشت نہیں رکھتے تھے۔ ہمارے دادا الحاج سید میاں گل شاہ اپنے خاندان اور علاقے میں واحد شخص تھے جنھوں نے اُس دور میں حرمین الشریفین کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں حج اور سفر کی صعوبتوں کا ادراک آج کے دور میں بہت مشکل ہے مگر

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

بلانے والے جب بلاتے ہیں تو اطاعت گزار سر کے بل بھی جانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔
ہمارے والد بھی 15،14 برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والد بزرگوار م کی اپنے والدین سے محبت کا میں خود گواہ ہوں کہ کئی مرتبہ ہمارے سامنے وہ اپنے والدین کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے اور اُن کی آواز بھرا جاتی۔ ہماری ہمشیرہ شہناز بی بی نے جب اُن کی زندگی کے واقعات کے ورق کھول کر سنانے شروع کیے تو والدین سے اُن کی محبت اور اطاعت کا ذکر بھی آ گیا۔ جو خود ہمارے جی صاحب کی زبانی ہے۔ فرماتے تھے کہ انہوں نے ابھی جوانی میں قدم رکھا ہی تھا کہ اُنکے والد شدید علیل ہو گئے۔ آپ کو بتایا گیا کہ موضع لنگر سے کوسوں دور ایک قصبہ حضرو ضلع (اٹک) میں ایک مُستند ہندو حکیم ہیں جو علاقے میں مانے ہوئے طبیب ہیں اور اُمید تھی کہ اُن کی دوائی سے افاقہ ہو گا۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ اپنے گاؤں میں صبح کی نماز پڑھ کر میں حضرو کے لیے روانہ ہوا اور ظہر کی اذانیں ہو رہی تھیں کہ میں حضرو پہنچ گیا۔ سیدھا حکیم صاحب کے پاس پہنچا اور مدعا بیان کیا۔

حکیم صاحب ہندو تھا میری پریشانی بھانپ گیا اور مجھے کہا کہ آپ جاؤ سامنے والی مسجد میں نماز پڑھ کر آؤ اور آپ کی دوائی تیار ہو گی۔ میں مسجد میں نماز پڑھ کر حکیم کے پاس واپس آیا تو دوائی تیار تھی۔ دوائی لی اور واپس گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب گاؤں کے شمالی قبرستان کے قریب پہنچا تو عصر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ آناً فاناً گھر پہنچا تو والد صاحب (ہمارے دادا جان) مجھے دیکھ کر حیرانی اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بستر پر بیٹھ گئے اور دوائی کھا کر مجھے دعائیں دینے لگے۔

میں نے ایک دفعہ پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ ہمارے والد صاحب دھان پان جسم کے مالک تھے اس کا اندازہ ہمیں اُن کے جسم دبانے سے ہوتا تھا لیکن لباس ایسا پہنتے تھے کہ ایک قوی الجثہ شخصیت نظر آتے تھے۔
ہر روز 10،8 کلومیٹر کا سفر ضرور کرتے۔ (ہماری زمینیں اور موضع لنگر جہاں ہمارے اور برداران رہتے تھے، موضع گکھڑ سے 5،4 کلومیٹر کے فاصلے پر تو ضرور ہے اور وہ بھی نیم پہاڑی راستہ مگر آپ کا معمول تھا کہ ہر روز وہاں جاتے باغ (ہمارے کھیت اور زمینیں جنھیں ہم باغ کے نام سے پکارتے تھے) کوئی کام ہوتا تو کر لیتے یا لنگر میں اپنے گھر جاتے، گاؤں کے دوستوں، عقیدت مندوں اور حاجت مندوں سے ملتے

اور شام سے پہلے واپس آجاتے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہمشیرہ ام شہناز بی بی والد صاحب کی زبانی سناتی ہیں کہ آپ ابھی جوان تھے والد بزرگوارم کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا اور والدہ بھی شدید بیمار پڑ گئیں۔

اس مرتبہ کسی نے موضع چوہڑ پال (جواب راولپنڈی شہر کا حصہ بن چکا ہے) میں کسی حکیم کا بتایا۔ آپ صبح سویرے دوائی کے لیے چل پڑے۔ واپسی پر اُسی طرح عصر کے وقت گھر کی ڈیوڑھی پر پہنچے تو والدہ گھر والوں سے پوچھ رہی تھیں کہ بیٹا واپس پہنچا ہے کہ نہیں؟ آپ بلا توقف والدہ کے پاس پہنچے ان کے آگے سر جھکایا دوائیاں پیش کیں تو والدہ نے کندھوں پر تھپکی دے کر ڈھیروں دعائیں دیں۔

اسی طرح کا ایک واقعہ راقم الحروف نے بزرگوارم سے خود سنا تھا کہ کم عمری میں ہی والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو کچھ عرصہ بعد والدہ بھی بیمار پڑ گئیں۔ جب علالت بہت بڑھنے لگی اور اُن کی مایوسی کے سائے گہرے ہونے لگے تو ایک دن بھرائی ہوئی آواز میں والدہ سے پو کیا آپ بھی مجھے اکیلا چھوڑ جائیں گی؟ تو فرمانے لگیں کہ فکر کیوں کرتے ہو، پہلے ایک حاجی جنت میں چلا آپ کے لئے دُعا گو ہے پھر دو ہو جائیں گے۔

__☆☆____☆☆____☆☆__



برادرم سید عنایت حسین شاہ

اپنی یاداشتوں کو سمیٹتے ہوئے بتاتے ہیں

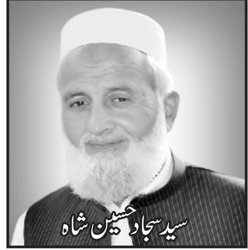
’’اللہ رب العزت کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جس نے مجھ ناچیز کو اپنے والد بزرگوار، جن کو اہل علاقہ گکھڑ والے پیر صاحب اور گکھڑ والے لنگر والے پیر صاحب کے نام سے یاد کرتے تھے کے بارے میں کچھ بتانے کی توفیق عطا فرمائی۔ پیر صاحب (والد بزرگوار) عموماً سفید پوش جامہ زیب تن رکھتے ہاتھ میں تسبیح اور درود شریف اور وظائف ہر وقت ان کے ورد زبان رہتے۔ پیدل چلتے ہوئے بظاہر ان کی چال ہموار ہوتی اور سبک رفتار نظر آتے مگر 80,70 سال کی عمر میں بھی پیدل چلنے میں نوجوان بھی اُن کا ساتھ نہ دے سکتے۔

سفر کے دوران باتوں میں ایسی شیرینی اور دلچسپی ہوتی کہ ہم سفر چاہتا کہ سفر جاری رہے اور میں یہ باتیں سُنتا رہوں۔

سفر کے حوالے سے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ غالباً 1972ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت میں زرعی اصلاحات ہوئیں۔ AC فتح جنگ نے آپ جناب کو اس حوالے سے اپنے دفتر واقع فتح جنگ بلایا تو جناب نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ رمضان کا مہینہ تھا اور کڑاکے کی گرمی۔ AC صاحب کے دفتر میں انتظار کرتے کرتے ایک بج گیا تو پتہ چلا کہ AC صاحب آرام کے لیے Rest room چلے گئے۔ ہم نے ساتھ والی مسجد میں نماز ظہر ادا کی واپس گئے تو AC صاحب نے چپڑاسی کے ذریعے اندر بلایا۔ کچھ دیر بعد والد محترم واپس آگئے اس دوران ڈھائی تین بج گئے۔ ڈاک بنگلے میں ہی تھوڑی دیر آرام کیا اور نماز عصر ادا کی۔ رمضان کا مہینہ تھا اب اٹک جانے والی کوئی گاڑی نہ رہی جب گرمی ذرا کم ہوئی تو جناب والد نے فرمایا کہ یہاں سٹیشن کے مشرقی جانب سے ایک راستہ گکھڑ کو جاتا ہے اس راستے پر چلتے ہیں۔ چنانچہ پیدل چل پڑے۔ راستے میں پنج ڈھیر نامی جگہ پر روزہ افطار کیا اور وہیں مغرب کی

نماز ادا کی اور پھر چل پڑے۔ راستہ خالص پہاڑی تھا اور کالا چٹا کے جنگل اور پہاڑوں کو عبور کرنا تھا۔ میں خود بھی راستے سے ناواقف تھا۔ چنانچہ راستہ ہم سے چھوٹ گیا میں نے بزرگوارم کو آگے آنے سے منع کیا اور خود ایک پہاڑ کی ٹیکری پر چڑھ گیا دُور ایک پانی کا تالاب اور ساتھ ایک بڑا درخت تاروں کی روشنی میں نظر آیا۔ میں نے ان کو بتایا۔ آپ نے فرمایا کہ ہم راستہ بھول آئے ہیں مگر یہاں سے نیچے اتریں تو دوسرا راستہ قریب ہے۔ چنانچہ وہاں سے واپس اتر کر تالاب کے قریب آئے تو معلوم ہوا کہ یہاں ایک چھوٹی سی آبادی موجود ہے کہ کتے کے بھونکنے کی آواز آئی ہم گھر کے مشرقی جانب تھے مگر کتا مغربی جانب دوڑ گیا۔ اس اثنا میں گھر سے ایک ادھیڑ عمر کا شخص نکلا اور ہمیں آواز دی۔ ہمارے جواب پر وہ ہماری طرف آیا اور نزدیک پہنچ کر جونہی والد محترم کو پہچانا تو بسم اللہ، بسم اللہ کہہ کر بغل گیر ہوا اور کہا کہ پیر جی میں تو آپ کو آسمان پر ڈھونڈ رہا تھا آپ مجھے زمین پر مل گئے۔ کہا کہ میں دو مرتبہ آپ کے گاؤں آیا مگر آپ نہیں ملے۔ پھر واپس گھر گیا اور اپنے بیٹوں اور گھر کی خواتین کو جگایا۔ انہیں نے بھی یہی الفاظ کہے کہ میں پیر صاحب کی تلاش میں تھا اور انہیں کھانا تیار کرنے کو کہا۔ ہمارے لیے فوری طور پر چارپائیاں اور بستر نکال کر گھر کے باہر لگائیں۔ اور کھانے سے تواضع کی۔ دورانِ تناول اُس نے کہا کہ میری نبض دیکھیں مگر آپ نے فرمایا کہ صبح نہار منہ دیکھیں گے اور پھر ہمیں آرام کے لیے چھوڑ کر وہ شخص اندر چلا گیا۔ سحری کے وقت وہ پھر آیا اور آپ کو نبض دکھائی۔ آپ نے حال پوچھ کر اُس کے لیے نسخہ تجویز کیا اور سحری کر کے نمازِ فجر ادا کر کے دوبارہ گکھڑ کے لیے روانہ ہوئے۔ جب ہم راستہ بھول گئے تھے تو آپ نے فرمایا کہ یاد رکھیں جب بھی راستہ بھول جائیں تو سورۃ الم نشرح کی تلاوت کریں۔ آپ کے نسخہ جات میں خداوند کریم نے شفا کاملہ رکھی تھی۔ چنانچہ آپ کی تجویز کردہ ادویات اور نسخوں سے آج تک ہر شخص کو شفا نصیب ہوئی۔ آپ ہمیشہ مریضوں کو بلا معاوضہ دوائی دیتے اور اگر دوائی تیار موجود نہ ہوتی نسخہ لکھ کر دیتے اور دوائی تیار کرنے اور استعمال کا طریقہ بتا دیتے اور ساتھ ہی صحت کے لیے دعا بھی فرماتے۔ نمازِ تہجد اور نمازِ اشراق تو گویا آپ کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ آپ کا معمول تھا کہ نماز باجماعت کے بعد قرآن کریم کی کسی آیت کا ترجمہ مختصر تفسیر کے ساتھ بیان کرتے اور مقتدیوں اور مریدین کو اجتماعی دعا کی تلقین

فرماتے۔ سب سے بڑی بات جو ہم نے بحیثیت اولاد بھی اُن میں دیکھی کہ اُن کی زندگی میں قول و فعل کا کوئی تضاد کبھی نہیں تھا۔ جو پند و نصائح وہ دوسروں کو کرتے ان کی اپنی زندگی اس کا عملی نمونہ تھی۔ جس بات کی تلقین دوسروں کو کرتے اپنی اولاد اور اقرباء سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔


سید سجاد حسین شاہ

ہمارے چھوٹے بھائی **سید سجاد حسین شاہ** نے والد صاحب سے خود سُنا ہوا ایک واقعہ سنایا۔

والد صاحب نے ایک دن گھر میں بیٹھے ہوئے سُنایا کہ وہ اپنے مُرشد حضرت خواجہ عبدالرحیم باغدروی کے ہمراہ پشاور میں تھے کہ پتہ چلا کہ قائداعظم محمد علی جناح صاحب پشاور کے اسلامیہ کالج میں خطاب کرنے والے ہیں چنانچہ ہم بھی انہیں دیکھنے اور سننے کے لیے وہاں گئے۔ سٹیج پر قائداعظم کو ایک بے ریش اور کلین شیو، سوٹڈ بوٹڈ انسان کو دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اس حلیے کا انسان ایک اسلامی مملکت کی سربراہی کیسے کرے گا۔ تاہم کے ساتھ اُن کی ہمشیرہ فاطمہ جناح کو ایک مسلم خاتون کے لباس میں دیکھ کر تسلی ہوئی۔ قائداعظم نے جب تقریر شروع کی تو اُن کا خطاب انگلش میں تھا مگر حیرت ہوئی کہ سامعین کی اکثریت انگلش زبان سے نابلد ہونے کے باوجود ہمہ تن گوش ہو کر اُن کی تقریر سُن رہی تھی تو اس بات نے مجھے متاثر کیا۔

تاہم 1950 میں جب سفر حج کے لیے کراچی میں قیام ہوا تو ملتان کے ایک حاجی صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ شاہ صاحب قائداعظم محمد علی جناح کے مزار پر جاتے ہیں تو میں نے دل میں کہا کہ حاجی صاحب کسی بزرگ کے مزار کی بات کریں تو کوئی بات بھی ہے مگر اُن کا دل رکھنے کے لیے ساتھ چل پڑا۔ احاطہ مزار میں پہنچ کر دیکھا تو ایک ٹینٹ لگا ہوا ہے جس کے نیچے قبر ہے۔ دعائے مغفرت کے لیے اُن کی قبر کے قریب بیٹھ گئے، مگر کچھ ہی دیر بعد ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شخص گردن سے پکڑ کر کہہ رہا ہے کہ قرآن کی تلاوت کرو، چنانچہ قبر کے ساتھ رکھے ہوئے قرآن مجید کو اٹھا کر تلاوت شروع کر دی۔ فرمانے لگے کہ اُس وقت قرآن کریم کی تلاوت سے جو سکون اور راحت نصیب ہوئی اُس طرح کا سکون پھر کبھی تلاوت میں نہ ملا۔ چنانچہ آج بھی سوچتا ہوں کہ برصغیر کے مسلمانوں کا یہ راہنما کوئی

عام انسان نہیں تھا۔ یقیناً اللہ کا برگزیدہ انسان اور دنیاوی صفات کے ساتھ ساتھ روحانی کمالات کا بھی حامل تھا۔ مملکت خداداد کی تخلیق کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فرستادہ انسان تھا۔

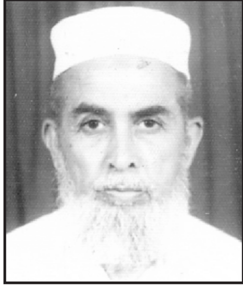
برادرم نے جب یہ واقع سُنایا تو میں نے قدرے حیرانی سے اُن سے پوچھا کہ والد صاحب بزرگوارم تو دسمبر 1985ء فوت ہوئے آپ کی عمر اس وقت کیا تھی تو انہوں نے بتایا کہ میں تو 1973 میں فوج میں بھرتی ہو چکا تھا اور بھرتی ہوئے بھی 12 سال ہو چکے تھے۔ اس پر مجھے اُن کی یادداشت پر ہونے والے شکوک ختم ہو گئے۔ (قائداعظم کے مزار پر فاتحہ خوانی کا ذکر عزیزم اسد حسین شاہ نے بھی اپنے مضمون میں زیادہ تفصیل سے کیا ہے)۔

پیر سبا کیوں کا چاند ڈوب گیا:

ہمارے بہنوئی کیپٹن ریٹائرڈ سید محمد جنید شاہ کے والد بزرگوار سید سیدن گل شاہ مرحوم رشتے میں ہمارے والد بزرگوار کے چچا تھے مگر عمر میں اُن سے کم تھے۔ والد صاحب کی علالت بستر مرگ کے وقت وہ خود بھی علیل اور صاحب فراش تھے۔ محترم سید جُنید شاہ کہتے ہیں کہ جب میں نے لالہ جی مرحوم کے وصال کی خبر بستر علالت پر اُن کو دی تو وہ آبدیدہ ہو گئے اور کچھ لمحے بعد اُن کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔ ''کاش پیر سبا کیوں کا چاند ڈوب گیا' اللہ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے''۔ پیر سباکؒ ہمارے خاندان کے جدِ اعلیٰ اور ایک بلند پایہ روحانی شخصیت تھے۔

__☆☆____☆☆____☆☆__

بے بے جی مرحومہ



قربان حسین شاہ

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی ان سے نجات پائے کیوں

میری پیاری بے بے جی۔ اللہ آپ کو غریق رحمت فرمائے۔ آمین۔

آپ ہم سب بھائیوں کی اسلامی و دینی تربیت اور ہماری زندگیوں کو مہر و محبت، وفا، استقامت اور تعاون کی صفات سے مرصع کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

اے ہماری بے بے جی صاحبہ!

آپ ہمیشہ ہمیں بُرے لوگوں کے قریب جانے سے روکتی رہیں۔ آپ ہمارے والد مرحوم کا دست و بازو تھیں۔ آپ ہم سے جُدا ہو گئی ہیں۔ پورا گھرانہ آپ کی یاد میں رنج والم سے دو چار ہے۔ ہمارے خاندان کا چھوٹا بڑا عورت، مرد، بوڑھا، جوان، ہمسائے، دوست، عزیز سب کے سب آپ کے غم میں پریشان ہیں۔ بلکہ وہ بچے اور بچیاں جن کو آپ نے قرآن پاک پڑھایا تھا۔ وہ جوانی تک بلکہ کچھ بڑھاپے تک آپ کا ذکر ہونے پر اب بھی روتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ بھی محبت پیار، خلوص اور ایک ہمدردانہ سلوک کا اثر اور نتیجہ ہے۔ آپ کی وفات کے بعد وہ گھر جس میں ہم بھائیوں نے آنکھیں کھولی ہیں۔ آپ کے بعد وہ چہل پہل اور وہ دُعاوں کی خوشبو محسوس نہیں ہوتی۔

میری پیاری بے بے جی صاحبہ!

بے ادبی اور گستاخی معاف کہ آپ کو مرحومہ لکھوں۔ کیونکہ آپ کا اور ہمارا تعلق اور محبت دلوں اور دماغ سے محو نہیں ہوسکتا۔ اور اگر والدہ اس فانی دُنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی اپنی اولاد کے لیے اللہ رب العزت کے ہاں دُعا کرتی ہے۔ اور یہی جُدائی ہم بھائیوں کے دلوں اور دماغوں میں بھی جا گزیں ہے۔ تو بعد معذرت آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے مرحومہ کا لفظ لکھنے کی بے ادبی کرنے کی جسارت کرر ہا ہوں۔ الفاظ مزید آگے بڑھنے سے انکاری ہیں۔ الفاظ آپکی مہربانیوں اور شفقتوں کو اپنے قالب میں ڈھالنے سے قاصر رہ گئے۔ مجھے وہ لمحات بار بار یاد آرہے ہیں۔ کہ جب میں نے آپ کے پاکیزہ چہرہ پر نظر ڈالی تھی۔ پہلے آپ اعزہ واقرباد کی موت پر پریشان ہو جاتی تھیں۔ یعنی جب ہماری خالہ آپ کی چھوٹی بہن فوت ہوئیں۔ اور آپ پر غم کے پہاڑ ٹوٹے۔ ہم سب چھوٹے تھے۔ آپ کو روتے ہوئے اور افسردہ دیکھ کر ہم رو کر آپ کے غم اور پریشانی میں آپ کا غم کم کرنے کی کوشش کرتے۔ اِسی طرح مجھ سے چھوٹی بہن جو آپ کو از حد پیاری تھی۔ اور ہم بھائیوں کو پیاری تھی کہ بہن تھی چھوٹی سی گڑیا تھی۔ شکل وصورت اللہ رب العزت نے اُسے خوبصورت دی تھی۔ اُس کی فوتیدگی نے بھی آپ کو اور آپکی صحت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا۔ پھر وہ وقت بھی نہ چاہتے ہوئے بھی آ گیا۔ کہ آپ کو پشاور کے پرانے مگر بڑے تاریخی ہسپتال (لیڈی ریڈنگ) میں برائے علاج داخل کرایا گیا۔ آپ عزیزوں اور اقربا کی جدائی پر روتی تھیں۔ پھر وہ وقت آ گیا۔ کہ لیڈی ریڈنگ کے تجربہ کار اور ماہر ڈاکٹر آپ کو موت کے خونخوار اور بے رحم پنجوں سے نہ بچا سکے۔ اور ہم رونے اور چیخ و پکار کے بغیر کچھ نہ کر سکے۔ کیونکہ کسی کے ساتھ ایسا حادثہ ہوا ہوگا۔ اور اُس نے یہ کہہ دیا۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہے سو آپ کرے ہم کو عبث بد نام کیا

آپ کا اس فانی دنیا سے رخصت ہونا اُن بچوں، خواتین کے لیے ایک نا قابل تلافی نقصان تھا۔ جو اُن سے درسِ قرآن پاک اور گھریلو مسائل میں رہنمائی اور مشورے کے لیے آتی تھیں۔ اور اُن کیساتھ مشورہ کر کے اور مطمئین ہو کر اپنے گھروں کو واپس جاتی تھیں۔ گاؤں بھر کی خواتین اُنہیں ادب واحترام سے ''ماسی جی'' کہا کرتی تھیں۔

اے ہماری بی بی جی صاحبہ!

کیا بتاؤں اور کیا لکھوں۔ اگر گاؤں کے بچے یعنی قرآن پاک پڑھنے والے یا عمر رسیدہ خواتین آپ کے پردہ پوش ہونے پر افسردہ ہوئیں۔ تو اُن کو مفید اور اچھے مشورے دینے والا کوئی نہیں رہا۔ اور پھر اگر ہم بھائیوں کی افسردگی کی وجہ پوچھی جائے تو ہم اپنی شفیق اور مہربان والدہ کی دُعاؤں سے محروم ہوگئے۔ ہم جب واپس اپنے گھر کو لوٹتے تو بسم اللہ سے ہمارا استقبال ہوتا۔ ہم آپ کو دیکھ کر مطمئن اور خوش ہوتے۔ وہ ہمیں دیکھ کر خوش ہوا کرتی تھیں۔ ہمارا نقصان ہر لحاظ سے زیادہ تھا لیکن ہم نے بھی بادل نخواستہ قبول کیا۔ اور آپ نے بھی ''کل نفس ذائقۃ الموت'' کے مطابق اللہ رب العزت کے فیصلے اور حکم کو قبول کرنا تھا۔ یہ اللہ کا فیصلہ اور پردہ پوش ہونا اگر سرکار مدینہ ﷺ جیسی ہستی کے لیے بھی تھا جس کے لیے قادر کریم نے یہ دُنیا پیدا کی ہے۔

راقم الحروف کی دوسری والدہ جو انتہائی نیک سیرت، بُلند اخلاق، پابند صوم صلوٰۃ اور ہم سب بھائیوں سے اُن کی محبت، پیار، خلوص بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا۔ وہ بھی ہمیں دُعاؤں میں یاد رکھتی تھیں۔ میرا پُختہ ایمان ہے کہ خاکسار جو کچھ ہے وہ اللہ کے فضل وکرم اور دونوں شفیق اور پابند صوم صلوٰۃ ماؤں کی دُعا کی اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ دونوں ماؤں کو اَجر عظیم سے نوازے۔ اللہ تعالیٰ آپکی بہترین مہمان نوازی فرمائے۔ اور آپکی مرقد کو تا حد نگاہ کشادہ فرمائے۔ اسے جنت کے باغوں میں ایک باغ بنا دے۔ ہمارے پورے خاندان کی طرف سے ان تمام کی طرف سے جن کے آپ پر حق تھے آپکو اجر عظیم عطا فرمائے۔ ہم مبتلائے درد ہیں اللہ تعالیٰ ہماری یاوری فرمائے۔ ہمیں حوصلہ بخشے کہ ہم اس عظیم صدمے کو برداشت کر سکیں۔ آمین یارب العامین۔

علامہ اقبال مرحوم اپنی والدہ کی وفات پر یوں فریاد کناں ہیں۔ خاکسار اُن کے ان اعلیٰ وارفع الفاظ خیالات اور جذبات کا اظہار علامہ اقبال مرحوم کی روح سے بصد معذرت پیش کرتا ہے۔

کس کو ہو گا وطن میں آہ میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاکِ مرقد پر لے کر تیری یہ فریاد آؤں گا
اب دُعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر میرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیر ی حیات
تھی سراپادین و دُنیا کا سبق تیری حیات
یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبہ میں دُعاؤں سے فضا معمور ہے
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نور ستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

__☆☆____☆☆____☆☆____☆☆__



بی بی خانم اور مدینہ خانم

ڈاکٹر سید اسد حسین شاہ

اپنے داداجی کے بارے میں مضمون لکھنے کے بعد میں مستقل اس بے کلی کا شکار رہا کہ کچھ کمی رہ گئی ہے اور مجھے اس کمی کا شعور بھی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے داداجی کا ذکر ان کی ازواج کے تذکرے کے بغیر ادھورا ہے لیکن ان خواتین کا ذکر صرف سرسری طور پر کر دینے سے میری تشفی ممکن نہیں تھی۔ اس لیے میں نے اپنے آپ کو اس پر مجبور پایا کہ ان کے لیے ایک علیحدہ سے مضمون لکھا جائے۔ سو اللہ کا نام لیکر ان خواتین کا ذکرِ جمیل شروع کرتا ہوں۔

میرے داداجی نے دو شادیاں کی تھیں۔ میری بڑی دادی ماں جو کہ رشتے میں میری سوتیلی دادی ماں تھیں۔ ان کا نام بی بی خانم جان تھا اور وہ داداجی کی خالہ زاد تھیں۔ میری والدہ روایت کرتی ہیں کہ میری والدہ کے استفسار پر داداجی نے انہیں بتایا تھا۔ کہ ان کی پہلی شادی ان کی والدہ کی خواہش پر ہوئی تھی۔ وہ اپنی بھانجی کو بہو بنانا چاہتی تھیں۔ لیکن بیٹے نے یہ اعتراض کیا کہ آپ کی بھانجی بہت ہی سادہ لوح ہے۔ اس پر ان کی والدہ نے فرمایا کہ بیٹا میری بھانجی سے تو تم ضرور شادی کرو۔ یہ میری خواہش ہے ہاں دوسری شادی تم اپنی پسند سے کر لینا۔ سو فرمانبردار بیٹے نے اپنی ماں کی بات مان لی۔

بی بی خانم جان (ہم انہیں لنگر والی ماجی اری کہتے تھے) ظاہراً واقعی انتہائی سادہ مزاج خاتون تھیں۔ ان کی سادگی خاندان بھر میں مشہور تھی۔ اور اسی سادگی کے سبب ان سے ایسی باتوں کا صدور ہو جاتا تھا جو ایک لطیفے کی طرح مشہور ہو جاتی تھیں۔ دادی جان کی ایک بہن تھی اور ایک بھائی۔ اور ان سے بہت محبت تھی۔ اپنے بھائی سید علی اکبر شاہ پر تو واری واری جاتی تھیں۔ اگر کبھی کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا اور لوگ دادی جان سے نام رکھنے کے بارے میں مشورہ طلب کرتے تو دادی جان ہر بار ایک ہی نام تجویز کرتیں "علی اکبر شاہ" اور اگر کوئی کہتا کہ ماں جی کوئی اور نام بھی بتایا کریں نا تو وہ بڑی لگاوٹ سے کہتیں "بھئی مجھے جو نام اچھا لگا بتا دیا بس"۔

ایک دفعہ میرے والد مرحوم دادی اماں سے ملنے گئے اور واپسی پر بڑی دیر تک ہنستے رہے۔ کہنے لگے کہ میں بے جی سے ملنے اکرم شاہ (ہمارے چچا) کے ڈیرے پر پہنچا تو ان کا ایک کتا بھونکنا شروع ہو گیا۔ بے جی کی دور سے نظر پڑی تو انہوں نے کتے کو ڈانٹنا شروع کر دیا اور کتے سے کہنے لگیں ''تمھیں نظر نہیں آتا میرا بیٹا آیا ہے تم کبھی کسی کو اپنے برابر کا بھی سمجھ لیا کرو''۔ ایک بار کسی نے دادی اماں کے سامنے ایک تصویر رکھ دی جس میں ان کے بیٹے (ہمارے چچا اکرم شاہ) اور ان کا کوئی دوست تھا۔ دادی اماں کی نظر کمزور تھی اس لیے وہ پہچان نہیں سکتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے پوچھا کہ ان میں اکرم شاہ کون سا ہے۔ اب تصویر دکھانے والے کو شرارت سوجھی اور اس نے چچا کے دوست کی تصویر پر انگلی رکھ دی کہ یہ اکرم شاہ ہے نا آپ ان کو نہیں پہچان پائیں۔ لیجئے صاحب دادی اماں نے اس کی بلائیں لینا شروع کر دیں اور ساتھ ہی پورے وثوق سے یہ رائے بھی دے دی کہ دیکھو نا میرا بیٹا کتنا خوبصورت ہے اور یہ ساتھ جو کھڑا ہے اس کا تو میرے بیٹے سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ یہ سن کر سب ہنس رہے تھے اور انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے۔ لیکن یہ سادہ لوحی صرف ظاہری سادگی تھی۔ حقیقت میں وہ ایک انتہائی عقلمند اور دور اندیش خاتون تھیں۔ ان کی نظر بہت دور تک دیکھتی تھی۔ ہم نے ان کو انتہائی پاکیزہ اور زاہدانہ زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے کبھی ہمیں سوتیلے پن کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ میں جب بھی ان سے ملا ان کی والہانہ شفقت اور محبت اپنے دامن میں سمیٹ کر لایا۔ دادی اماں اکثر روزے سے ہوتیں اس قدر زیادہ روزے رکھتے ہوئے میں نے کسی مرد و زن کو نہیں دیکھا۔ میری والدہ کے بقول وہ سال کے نصف سے زیادہ روزہ رکھتیں۔ اس وجہ سے ان کے ہونٹوں پہ جمی ہوئی خشکی کی تہہ ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھیں۔

ہم نے ان کو بڑھاپے میں دیکھا۔ اس وقت گھر کے کام کاج ان کی بہوؤں نے سنبھال لیے تھے لیکن ان کی خوش سلیقگی کی ایک علامت ہر وقت ان کے گلے میں آویزاں ہوتی تھی۔ ان کے گلے میں پیتل کے بنے ہوئے دو تین اوزار لاکٹ کی طرح ہمہ وقت موجود ہوتے تھے۔ اور جب بچے ان سے پوچھتے کہ ماں جی یہ کیا چیزیں ہیں تو وہ گلے سے اُتار کر دکھاتیں اور بتاتیں کہ یہ دانتوں کا خلال کرنے

کے لیے ہے اور یہ کان صاف کرنے کے لیے۔ ان کے علاوہ کبھی کسی کے پاس میں نے یہ چیزیں اس طرح زیرِ استعمال نہیں دیکھیں۔ میری والدہ نے مجھے بتایا کہ جب ہمارے دادا جی نے دوسری شادی کی تو دادی اماں کے انتہائی شفیق اور محبّ بھائی نے اپنی بہن کی تسلی کے لیے یہ پیشکش کی وہ ان کے گھر منتقل ہو جائیں لیکن دادی اماں نے یہ پیشکش یہ کہتے ہوئے قبول نہیں کی کہ میری عزت میرے خاوند کے گھر پر ہی ہے میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ جب میں نے یہ بات سنی تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ خاتون سادہ لوح تھی۔ اگر اسی کا نام سادہ لوحی ہے تو پھر ساری دنیا کی عقلمندی اور ذہانت اس سادہ لوحی پر قربان اگر وہ خاتون اس لمحے جذبات میں آ کر کوئی غلط فیصلہ کر لیتی تو آج میں اپنے آدھے کے قریب ددھیالی خاندان سے محروم ہوتا۔ اور خاندان میں پھوٹ کی ایسی بنیاد پڑ جاتی جو نسلوں تک قائم رہتی۔ اور آج میں ایک بڑی محبت سے محروم ہوتا لیکن ان کی دانائی کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا اور آج میں بہت فخر سے کہتا ہوں کہ میرے آٹھ چچا ہیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنی اس صابر و شاکر بندی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ میری والدہ کے بقول دادا جی کی دونوں ازواج میں بہت اتفاق اور سلوک تھا وہ ہمیشہ ایک دوسرے کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کرتیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کو بہنوں کی طرح قبول کر لیا تھا اور ان کے اس رویے کی بدولت ہی ان کی اولاد میں بھی ہمیشہ محبت اور اتفاق قائم رہا۔

میری دوسری دادی اماں (میری سگی دادی جان) کا نام مدینہ خانم تھا۔ اس خاتون کا تذکرہ کرتے ہوئے مجھے ایک شدید کمی کا احساس ہو رہا ہے اور وہ یہ کہ میں ان کے ذکر کا حق کبھی بھی ادا نہیں کر پاؤں گا۔ ان کی شخصیت کا احاطہ کرنے کے لیے قلم میں جو صلاحیت درکار ہے وہ میرے پاس نہیں ہے۔ بس دعا ہی کر سکتا ہوں کہ ان کا ذکر کر پاؤں۔ محبت، شفقت، ممتا، وفا، ایثار، خوش اخلاقی، انکساری، سلیقہ، گھر داری، تقویٰ اور پرہیز گاری ان کی کس خوبی کا ذکر کروں اور کس کو چھوڑوں۔ بس چند مثالیں ہی عرض کر دیتا ہوں۔ مجھے بچپن میں مرغی کلیجی کھانے کا بہت شوق ہوتا تھا اور گھر میں مرغی کبھی کبھار ہی پکتی تھی۔ لیکن دادی اماں کو اپنے پوتے کی پسند ہمیشہ یاد رہتی تھی۔ گھر میں جب بھی کبھی کسی مہمان کی آمد پر یا کسی اور موقع پر مرغی بنا دیتیں تو میرے لیے کلیجی بھون کر علیحدہ سے رکھ دیتیں اور پھر میرا انتظار کرتیں اور جب

میں نظر آتا تو دور سے مجھے آواز دیتیں ''اسد میرے کلیجے'' آ جاؤ تمھاری لیے میں نے مرغی کی کلیجی تیار کی ہے۔اور میں بھاگ کر ان کی گود میں جا بیٹھتا اور وہ ہاتھوں سے مجھے کھلاتیں۔دادی اماں کے عموماً دو ہی مشاغل ہوتے گھر داری یا بچوں کو قرآن پڑھانا۔صحن کی غربی دیوار کے ساتھ ایک مٹی کا چبوترہ بنا ہوا تھا اور چبوترے کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سے انگیٹھی اور اس میں مٹی کا چولہا۔گاؤں کے بچے اس چبوترے پر بیٹھ کر قرآن پڑھتے اور دادی اماں ساتھ ہی اپنا کچن بھی چلا رہی ہوتیں۔ ہر بچہ اپنا علیحدہ علیحدہ سبق پڑھ رہا ہوتا اور ان کی آوازیں گونج رہی ہوتیں لیکن دادی اماں جیسے ہر ایک پر متوجہ ہوتیں اور جہاں کہیں کوئی غلطی کرتا تو اسے نام لے کر پکارتیں اور اصلاح کر دیتیں۔انہیں مجھ سے اور مجھے ان سے کچھ خاص ہی انسیت تھی۔ مجھے پکارنے کے لیے وہ ہمیشہ مجھے میرا چن، میرا سوھنا یا میرا کلیجہ کہتیں۔ مجھے بھی دادی اماں سے نسبت رکھنے والی ہر چیز اچھی لگتی تھی۔ مجھے ان کے صحن میں لگے چنبیلی کے پودے سے زیادہ خوبصورت اور خوشبودار پھول یا پودا کوئی نہیں ملا۔ کیونکہ اس میں میری دادی کی خوشبو تھی۔ میری دادی کے سر پر اوڑھا ہوا سفید ململ کا دوپٹہ آج بھی میرے لیے سب سے زیادہ صاف، اجلا اور مقدس دوپٹہ ہے۔ ان کی مسکراہٹ دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت مسکراہٹ اور ان کی ناک میں پڑا ہوا کوکا (لونگ) دنیا کا سب سے سٹائلش اور خوبصورت زیور ہے۔

میری والدہ ان کی بہو تھیں۔اور ساس بہو میں اگر کوئی چپقلش ہو تو اسے ایک فطری امر سمجھا جاتا ہے۔لیکن میری والدہ جب بھی اپنی ساس کا ذکر کرتی ہیں تو ایسے لگتا ہے جیسے ان کی ساس سے زیادہ خوبیوں والی کوئی عورت دنیا میں ہے ہی نہیں۔اور کبھی کبھار یوں لگتا ہے جیسے وہ مبالغہ کر رہی ہوں لیکن اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوتا سچ یہ ہے کہ حسن اخلاق اور حسن کردار اپنے آپ کو منوا ہی لیتا ہے اور میری والدہ اعتراف حقیقت سے کبھی ہچکچاتی نہیں ہیں۔ مدینہ خانم میں ایک خوبی باقی سب خوبیوں سے ممتاز تھی اور وہ تھی اپنے شوہر کی محبت اور ان سے وفا اور اطاعت شعاری۔ میاں بیوں میں چھوٹی موٹی نوک جھونک یا لڑائی جھگڑا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ دادی اور دادا جان بھی اس روایت سے مستثنیٰ نہیں تھے لیکن میں نے کبھی بھی دادی اماں کو اپنے خاوند کے سامنے اُونچی آواز سے بات کرتے نہیں سُنا۔

مجھے ایک واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔دادا جی حج کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔گھر پر لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔لوگ ان سے دعا کی گزارش کر رہے تھے۔اور وہ سب سے وعدہ کر رہے تھے۔دادا جی غالباً چار پائی پر بیٹھے تھے اور گاؤں کی خواتین باری باری اپنی درخواست پیش کر رہی تھیں۔دادی اماں نے سوچا کہ چلو میں بھی دعا کے لیے کہہ دوں۔سو انہوں نے بھی موقعہ دیکھ کر کہہ دیا کہ ''جی میرے لیے بھی دعا کیجئے گا''۔ دادا جی نے ان کی بات سنی اور صاف صاف انکار کر دیا اور دوسری طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ یہ ان کی شرارت تھی۔لیکن میں نے تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ دادی اماں دوسرے کمرے میں بیٹھی زور زور سے رو رہی رہیں میں نے ان سے وجہ پوچھی تو پھٹ پڑیں۔''دیکھو نا میرے چاند'' میں نے اُن کا کیا بگاڑا ہے سارے جہان کے لیے دُعائیں کرتے ہیں اور اللہ ان کی دعائیں قبول بھی کرتا ہے اگر میرے لیے دعا کر دیں گے تو کون سی آفت آ جائے گی۔اللہ اللہ یہ سادگی یہ محبت یہ فریفتگی۔اس دنیا پہ اللہ کا بڑا کرم ہے اسکی بڑی عنایات ہیں دنیا والوں پر۔کیسی کیسی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔توانائی کے کیا کیا چشمے ابل پڑے ہیں لیکن کچھ چیزوں سے یہ دنیا محروم ہوتی جا رہی ہے اور وہ ہے رشتوں کا تقدس اور ان کی آپس میں محبت۔اللہ کرے آج کے دور کے عقلمند انسان کو اس کمی کا احساس جلد ہو جائے اور وہ اس نعمت کو ناپید نہ ہونے دے۔گھر داری اور خوش سلیقگی دادی اماں پر ختم تھی۔دادا جی بہت زیادہ مہمان نواز شخصیت تھے۔مہمانوں کا آنا جانا بند ہی نہیں ہوتا تھا اور گھر میں کوئی ملازم بھی نہیں تھا اس لیے سارے کام کاج دادی اماں خود اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں۔اور ہر کام پورے سلیقے اور نک سک سے۔ان کا گھر ہمیشہ صاف ستھرا رہتا کبھی کوئی بے ترتیبی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی تھی۔جو بھی وسائل میسر ہوتے ان کو انتہائی حساب کتاب سلیقے سے استعمال میں لاتیں اس وجہ سے کم وسائل بھی وافر محسوس ہوتے۔میں نے جب پڑھنا لکھنا شروع کیا تو مجھے دادا اور دادی دونوں کی طرف سے بہت حوصلہ افزائی ملی۔میں تختی لکھتا تو دادا جی کو دکھاتا اور وہ مجھے شاباش بھی دیتے اور انعام بھی۔جبکہ دادی اماں میری سامع تھیں۔میں کوئی بھی کتاب یا تحریر اٹھا لاتا اور ان کے سامنے پڑھنا شروع کر دیتا۔وہ میری بلائیں لیتیں، دعائیں دیتیں اور تعریفیں کرتی جاتیں۔اس سلسلے کا ایک واقعہ میری یاداشت پر گویا ثبت ہو گیا بلکہ میری شخصیت پر نقش

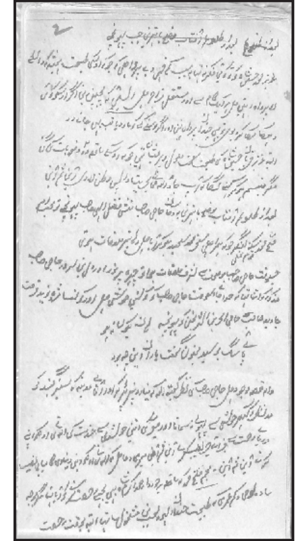
ہو گیا۔ ایک دفعہ میں دادا جی کی الماری سے ایک کتاب اُٹھا لایا۔ کتاب کا نام تھا ''بارہ تقریریں''، یہ کتاب کسی عالم نے نوآموز خطباء کی تربیت کے لیے لکھی تھی اور اس میں سال کے بارہ مہینوں کے حساب سے مختلف عنوانات پر مثال کے طور پر تقریریں لکھی گئیں تھیں۔ یہ ایک دلچسپ کتاب تھی۔ پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آپ کسی ماہر خطیب کی تقریر سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ میں یہ کتاب اکثر دادی اماں کے پاس لے جاتا اور کہیں سے بھی پڑھنا شروع کر دیتا۔ رنگ برنگ واقعات، حکایات اور کہیں کہیں خطیبانہ لطائف۔ دادی اماں بہت محظوظ ہوتیں۔ میں پڑھتا جاتا اور وہ مجھے داد دیتی جاتیں۔ لیکن ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔ میں اپنی عادت کے مطابق ایک رٹو طوطے کی طرح کتاب پڑھتا جا رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ تحریر کا مطلب کیا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ دادی اماں چارپائی پہ لیٹی ہوئی تھیں اور میں ان کے پاس بیٹھا کتاب پڑھتا جا رہا تھا۔ چند فقرے مزید پڑھنے کے بعد میں نے دادی اماں کی طرف پلٹ کر دیکھا تو انہوں نے اپنے ململ کے سفید دوپٹے سے اپنا چہرہ ڈھانکا ہوا تھا۔ اور دوپٹہ ان کے آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ مجھے آج داد نہیں مل رہی تھی اسکی بجائے دادی اماں مستقل سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھیں۔ میں پڑھتا رہا لیکن اس الجھن میں رہا کہ کہ کیا ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ دادی اماں نے بمشکل مجھے پکارا ''بس کر میرے چن میرے کلیجے میں مزید سکت نہیں ہے'' میں خاموش ہو گیا اور کتاب اٹھا کر دادا جی کے کمرے میں چلا گیا۔ اور دوبارہ وہیں سے پڑھنے لگا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ آخر اس تحریر میں ایسی کیا بات ہے جس نے میری دادی اماں کو رُلا دیا۔

یہ محرم کے مہینے کی تقریر تھی اس میں ایک واقعے کا ذکر تھا۔ کسی کربلا کا تذکرہ تھا کوئی لوگ تھے جنہیں اہل بیت کہا جاتا تھا۔ ان پر بڑا ظلم ہوا تھا۔ ان میں کوئی چھ ماہ کا بچہ بھی تھا اس کے گلے میں کسی نے تیر مار دیا تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی بچی کا ذکر بھی تھا جسے بہت پیاس لگی تھی لیکن اسے پانی نہیں مل رہا تھا۔ کچھ پردہ دار بیبیاں تھیں جن کے خیمے جلا دیئے گئے تھے اور ان کی چادریں چھین لی گئی تھیں۔ کچھ قتل کر دئے گئے اور ان کی سر بریدہ لاشوں کو پامال کر دیا گیا۔ میں پڑھتا گیا اور مجھے سمجھ آنا شروع ہو گیا کہ دادی اماں کیوں رو رہی تھیں اور پھر میں نے بھی رونا شروع کر دیا۔ یہ لگ بھگ چالیس برس پرانا واقعہ

تھا۔ مدینہ خانم کو بھی دنیا سے گئے کئی دھائیاں بیت گئیں۔ لیکن آج بھی جب کبھی محرم اور کربلا کا ذکر ہوتا ہے تو میری آنکھیں مدینہ خانم کی آنکھیں بن جاتی ہیں۔ اپنی آنکھوں کو بہت روکتا ہوں کہ بس کرو ''میرے کلیجے میں اتنی سکت نہیں ہے۔'' دیکھو شہیدوں کو روتے نہیں ہیں، سنو یہ چودہ صدیاں پہلے کا ذکر ہے، مان لو بھئی یہ شہزادوں کی لڑائی تھی، یہ دیکھو فتویٰ ہے کہ بغاوت تھی کچل دی گئی''۔ لیکن مدینہ خانم کی آنکھیں ہیں مانتی ہی نہیں روز و شب گزرتے ہیں پھر محرم، پھر وہی کربلا اور کربلا کی ریت، وہی دہشت اور حدت کی شدت، وہی بیعت پر اصرار، وہی جھکنے سے انکار، وہی آل رسول ﷺ کے گلے اور وہی حاکم کی تلوار اور پھر وہی مدینہ خانم کی آنکھیں اور وہی آنسو، وہی سسکیاں اور وہی آہیں۔ خدا جانے یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ چودہ صدیاں بیت گئیں کربلا کے زخم تازہ ہیں اور مدینہ خانم کے آنسو بھی شاید بروز حشر ہی کوئی دلاسہ ملے، کچھ قرار آئے۔

بچپن میں میں جب بھی اپنی دادی اماں کا نام سنتا تھا تو مجھے عجیب سا محسوس ہوتا تھا کہ بھلا یہ بھی کیا نام ہوا ''مدینہ خانم''، مدینہ تو ایک شہر کا نام ہے یہ کسی خاتون کا نام کیسے ہو سکتا ہے۔ اور میری یہ حیرت برس ھا برس قائم رہی۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ میں نے مدینہ دیکھ لیا۔ اور اب مجھے اپنی دادی کا نام عجیب نہیں لگتا۔ کیونکہ مدینہ بالکل میری دادی جیسا تھا۔ مدینہ کی فضا میں وہی محبت، شفقت، مٹھاس، عنایت، عطا فراخی اور سکون تھا جو میری دادی کے مزاج اور شخصیت میں تھا۔ میں اپنی دادی کو کوئی دُعا دوں ان کے لیے ہر دعا چھوٹی ہے ان کا کیا ذکر کروں لفظوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے بس انہیں سلام کہتا ہوں اور یہ عرض کرتا ہوں۔ ماں جی آپ رب سے راضی تھیں آپ کا رب آپ سے راضی ہو۔ مدینہ خانم آپ کو مدینہ کے والی سے محبت تھی آپ کو اس رحمت عالم ﷺ، آپ کے جد امجد کی ہمسائیگی نصیب ہو۔

__☆☆____☆☆____☆☆__



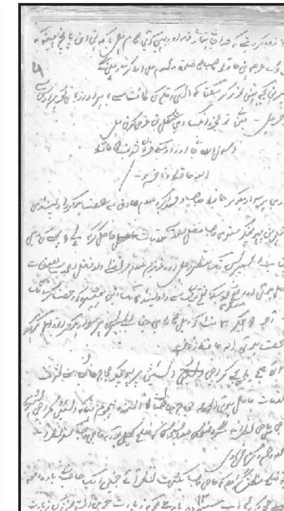


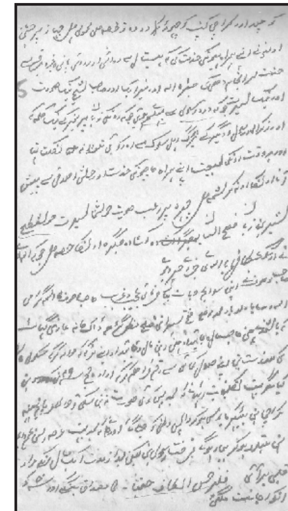
سفرِ حجاز

(گھر سے لے کر حرمین شریفین سے واپسی تک والد بزرگوار الحاج سید محمد علی شاہ مرحوم کا خودنوشت سفر نامہ)

سفر نامے کے بارے میں تعارفی کلمات

یہ سفر نامہ والدم صاحب مرحوم و مغفور کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اورمیں نے پہلے اس تحریر کی اپنے ہاتھ سے نقل تیار کی اور پھر کمپوزنگ کے لیے دیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ مذکورہ تحریر کو آجکل کے نوجوان کمپوزر نہیں پڑھ سکتے کیونکہ والدم بزرگوارم کی تحریر کا خط اُس زمانے کے مطابق عربی رسم الخط سے ملتا ہے لہذا میرے اُردو رسم الخط میں لکھنے سے کمپوزر کے لیے اس کا پڑھنا زیادہ آسان ہو گیا۔





یہ بھی بتاتا چلوں کہ والد مرحوم کے بارے میں کتاب لکھنے کا محرک ہی دراصل یہ سفر نامہ بنا۔ برادران کے پاس محفوظ والد مرحوم کی لائبریری میں اچانک ایک دن جب یہ سفر نامہ میرے

ہاتھ لگا تو میں اُسے پڑھنے بیٹھ گیا۔ والد مرحوم کی تحریر سے مانوس ہونے کی وجہ سے پڑھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ لہٰذا شروع سے آخر تک ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ سفر نامے کے مندرجات یقیناً میرے لیے دلچسپی کا باعث تھے۔ 1950ء میں سفر کی طوالت اور سہولیات کی عدم دستیابی کا موازنہ اگر آج کے حجاج کے سفروں سے کیا جائے تو بہت سے حقائق حیران کن لگتے ہیں۔ تاہم اس سفر نامے میں گھر سے ان کے الوداع ہونے کے مناظر، دوستوں، احباب اور کمسن اولاد کا ذکر، خندہ پیشانی سے برداشت کی جانے والی صعوبتوں کا ذکر، کراچی اور مکہ میں حاجی کیمپ کا ذکر، حج کے یکطرفہ کرایے اور اخراجات کا ذکر، جو مثال کے طور پر اس زمانے میں راولپنڈی سے کراچی کا ٹکٹ (بذریعہ ریل) پاسپورٹ اور سعودی معلم کی فیس کل ملا کر 597 روپے 5 آنے بنتا تھا (ایک روپے میں 16 آنے ہوتے تھے)۔ پھر مظفر گڑھ کے ایک نیک دل حاجی اللہ وسایا کا ذکر، حاجی کیمپ کے ایک نیک دل آفیسر نیازی صاحب کا ذکر، مقامات مقدسہ کو دیکھنے کی سعودی حکومت کی پابندیاں ان سب کا ذکر اس مختصر سفر نامے میں ملتا ہے۔

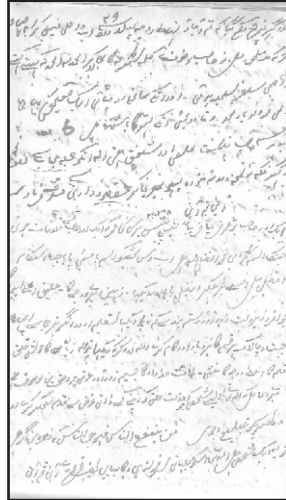
27 مئی 1950ء کو گھر سے ہونے والے سفر کا آغاز کیا۔ 3 جون 1950ء بحری جہاز پر سوار ہوئے اور 11 دن کے سمندری سفر کے بعد 13 جون کو جدہ بندرگاہ پہنچے۔ 15 جون 1950ء یکم رمضان کو مکہ مکرمہ پہنچ کر سفر کا ایک مرحلہ مکمل ہوتا ہے۔ (کہاں آج کا پشاور اور اسلام آباد سے 4 گھنٹے میں سعودی عرب پہنچنا اور کہاں 11 روز کا ٹانگے، ریل اور بحری جہاز کا سفر) اس دوران سفر کی صعوبتوں اور رُکاوٹوں سے قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہے لیکن عشق رسول ﷺ کے شوق میں شکر کے کلمات ہی پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اپنے ہم سفر ساتھیوں کی خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مدینہ منورہ کب پہنچتے ہیں اس کا خصوصی ذکر نہیں ملتا تاہم اندازہ ہوتا ہے کہ 10 رمضان کو وہ مکہ شریف سے مدینہ منورہ پہنچتے ہیں۔ 20 روز رمضان شریف کے اور 8 روز شوال المکرمّ کے مسجد نبوی میں گزارنے اور 28 روز کی تمام نمازیں فرض اور نوافل ریاض الجنتہ (مابین منبر و بیت) میں ادا کرنے کی سعادت حاصل کی سبحان اللہ آج اگر ہمارے جیسا کوئی حاجی یا عمرہ ادا کرنے ریاض الجنتہ میں ایک لمحہ کے لیے رک کر دو نوافل ادا کر سکے تو اس پر بھی فخر سے پھولے نہیں سماتا۔

یہاں پر روضۂ رسول کی زیارت اس کے لیے پاسِ ادب، غارِ سعد میں حضورﷺ کا تین دن کے لیے غائب رہنا اور امت کی بخشش کی دعا۔ صحابہ کرام اور دخترِ رسولﷺ فاطمۃ الزہرا کی پریشانی اور آخر میں رب کائنات کا جوش میں آکر امت کی بخشش کی دعا قبول کرنا جیسے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔

آخری حصہ میں عشق رسولﷺ میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں باغ شمس کا ذکر، جہاں پر حضورﷺ اپنے عمزاد بھائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی گود میں سر رکھ کر آرام فرما رہے ہوتے ہیں کہ آپﷺ کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ علیؓ اپنی ران تک نہیں ہلاتے کہ مبادا محبوبِ خدا کے آرام میں خلل آجائے اور ان کی نیند خراب ہو جائے، آنکھ کھلتی ہے تو حضورﷺ علیؓ کے چہرے پر خوشی اور مسرت کے ساتھ پریشانی کے آثار بھی دیکھتے ہیں، علیؓ نماز کے قضا ہونے کا ذکر کرتے ہیں، حضورﷺ کہتے ہیں، ''تم نے ایسا کیوں کیا، نماز پڑھنے کے لیے مجھے جگا دیتے''۔ علیؓ فرماتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ میں محبوب خدا کو بے آرام کر کے خدا کو راضی کرتا۔ سبحان اللہ۔ اللہ کو اپنے محبوبﷺ کے بھائی کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ جبرائیل کو پیغام دے کر بھیجا کہ جاؤ میرے محبوب کو کہو کہ اللہ کے حکم سے سورج کھڑا ہے اور علیؓ نماز ادا کرلیں۔ اس موقع پر مولا کریم نے ارشاد فرمایا ''اگر علیؓ قیامت تک نماز ادا نہ کرسکتے تو یہ سورج قیامت تک کھڑا رہتا''۔۔۔ سبحان اللہ

سفر نامہ میں حج سے واپسی کی تاریخ درج نہیں ہے مگر ایک جگہ ذکر ہے کہ غلہ وغیرہ اور سامان خوراک اتنا خریدا گیا کہ پانچ ماہ کے لئے کافی ہو۔ چنانچہ اندازہ ہے کہ آپ کم از کم چھ ماہ بعد حج سے واپس تشریف لائے۔

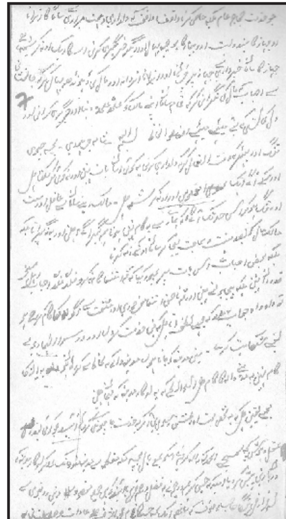
عشق و مستی و انکسار میں ڈوبے واقعات پڑھ کر انسان حیرت و استعجاب میں ڈوبا ہوتا ہے کہ سفر نامے کی تحریر اچانک ختم ہوجاتی ہے اور اگلے صفحات بالکل سفید ہیں، اگلے دنوں یعنی دوبارہ مکہ جا کر حج کے مناسک کا ذکر اور واپسی کے سفر کا ذکر نہیں ملتا، اندازہ ہوتا ہے، کہ اگلے واقعات کو قلمبند کرنے کے لیے آپ کو وہاں فرصت نہیں مل سکی اور واپس گھر آکر بھی اتنی فرصت نہ مل سکی کہ بقایا مدت کی داستان سفر کی تکمیل کرسکتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ کاش ہم جیسے کوتاہ اندیش اور بے قدرے انسان اِن کی حیات میں اس کمی کو نوٹ کر کے اُن سے اس داستان عشق و محبت کی تکمیل کروالیتے۔۔ کاش (مؤلف)



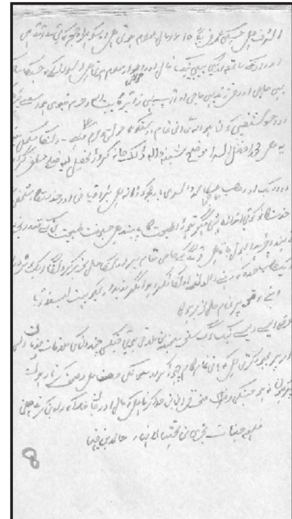
سفرِ حجاز (اصل کی نقل)

(گھر سے لے کر حرمین شریفین سے واپسی تک والد بزرگوار الحاج سید محمد علی شاہ مرحوم کا خود نوشت سفرنامہ)

27 مئی 1950ء صبح سویرے قبل از نماز صبح گھر سے بمعہ عزیزان محمد حسین شاہ و قربان حسین شاہ روانہ ہوکر باہر نکلا تو دو اشخاص معتبرین شہر ملک نادر و ملک سلطان جو کہ فقیر کو محض رضائے خدا و رسولﷺ کے لیے تشریف اور ہوئے۔ رخصت کرنے کے لیے میں اُنکی اس محبت پر حیران ہوں جو کہ انہوں نے رضائے خدا کے لیے رات کے وقت ٹھکراتے ہوئے آخری الوداعی کی۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جزائے خیر دے آمین۔ بعدازاں ماما گلاب مستری جو کہ نہایت ہی حیران و محبت، حیرانی و پریشانی اس لیے کہ میری فرقت اُس کو گوارا نہ تھی اور خوشی اس واسطے کہ فقیر کا ارادہ حرمین شریفین کا تھا اور وہ پھولے نہ سماتا تھا۔ مبارکباد، مبارکباد۔ بعدازاں محترم سلیمان شاہ کو میٹھی نیند سے جگا کر ہمراہی ہوئے تو عزیز مذکور کی طبیعت بہت گھبرائی ہوئی لیکن برخوردار مذکور کو اطمینان و تسلی واپس کر راہی سفر سعید ہوئے۔



ماما مرزا جو کہ فقیر کا ایک دوست اور خادم تھا فقیر کے ساتھ روانہ ہوکر باہتر آ پہنچا راستہ میں خوب مجلس دل کھول کر کی۔ اللہ تعالیٰ اُس کو جزائے خیر نصیب فرمائے۔



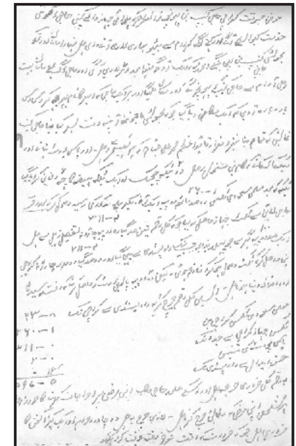
مرزا اندکور نے اپنے حسب طاقت وحسب اللہ ایک جوڑا پاپوش سادہ قسم کا بہت جوش محبت سے بنوا کر فقیر کو دیا لیکن فقیر نے اُس کی ضرورت نہ محسوس کرتے ہوئے اپنے ساتھ لے آیا تا کہ خطہ مقدس عرب میں ماما مرزا کی پاپوش پائے ملبوس کر کے اُس کی محبت کے دریا کو ٹھنڈک سے سرد کروں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جزائے خیر دے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ میں اگر حاجی کی خدمت کی تو مجھے بھی اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے گا۔

جزاہ اللہ فی الدارین۔

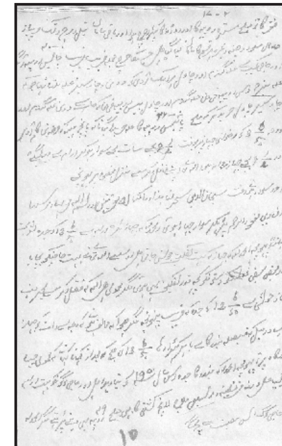
بعداز طلوع آفتاب موضع باہتر جب پہنچے۔ عزیز محمد حسین شاہ کو تو کوئی فکر نہ تھا بہ سبب کم فہمی ولا پرواہی کہ جو اُس کی طبیعت ہمیشہ کے واسطے لاپرواہ رہتی ہے ہر ایک کام سے اور مستقل مزاج ہے کہ بچپن میں اگر اُس کو کوئی دھکا مکا کر دیں تو بھی چنداں پروا نہیں اور اگر اُس نے کسی کو مار دیا تب بھی جانے دو۔ البتہ عزیز قربان حسین شاہ کی طبیعت سخت ملول وپریشان تھی۔ اُس کے ساتھ دو دفعہ بات کی گئی مگر مُتبسم ہو کر کہنے لگا کہ آپ جاؤ اللہ تعالیٰ بخیریت وطن واپس لادے۔ آمین ثم آمین

بعداز طلوع آفتاب موضع

باہتر میں بہ دکان حاجی صاحب منشی فضل الٰہی صاحب پہنچے تو محبّ اُم فتح محمد سکنہ لنگر جو کہ ہمراہی سفر سعید ہو کر آیا ہے سے وہاں پر ملاقات ہوئی۔ جس وقت حاجی صاحب موصوف سے ملاقات ہوا تو چہرہ مسرور اور



دل میں سرور، حاجی صاحب مذکور کو اتنا تھا کہ خدا جانے اس وقت حاجی صاحب کو کونسی خوشی ہے اور کونسا مژدہ نوید فرحت حاجی الحرمین الشریفین کو پہنچا، ہاں کیوں نہ ہو۔



پائے سگ بوسید مجنون گفت یاراں ایں چہ بود

والا قصہ موجود ہے حاجی صاحب کی نظر کعبتہ اللہ کے مینار پر پڑ کر اور آقائے مدینہ کے سبز گنبد کو مدنظر رکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتا اور فقیر کی اتنی خوش دلی سے خدمت کی اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے دربارِ رحمت سے جزائے خیر نصیب کرے آمین ثُم آمین۔

میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو دینی و دنیاوی کامیابی نصیب فرمائے۔ آمین ثُم آمین۔ فتح محمد کے ساتھ برخوردار محمد اکرم شاہ بھی مجھے رخصت کرنے آیا تھا مگر بوجہ سادہ لوحی وکم عمری کے طبیعت لہو ولعب میں مشغول تھا البتہ بوقت رخصت چشم نم ہو کر اور روتا روتا ہوا مصافحہ کر لیا۔

اڈہ ٹانگہ پر بہت سے اصحاب متصل بورڈنگ رخصت کرنے کے موجود تھے جن میں خاص خاص صاحبان ہیڈ ماسٹر صاحب، مولوی امیر داد صاحب، سیکنڈ ماسٹر مزمل شاہ صاحب، شاہ رحم دریا صاحب، مڈل سکول باہتر کے ہیڈ ماسٹر، امام مسجد مسجد کشمیریاں ومیاں احمد صاحب سکنہ باہتر دوا فروش صاحب میاں محمد ومولوی صاحب سلطان خان مدرس مدرسہ لنگر سکنہ باہتر وجملہ اصحاب موجود تھے۔ لیکن اول الذکر ہیڈ ماسٹر صاحب مولوی امیر داد صاحب نے مجھ کو بارگاہ رسالت حضرت محمد صلعم کی حاضری کی التجا و نصیحت درد آمیز کی، مجھے تا زندگانی کبھی نہ بھولے گی اور میرا وعدہ ہے کہ بشرط خیریت فقیر مدینہ منورہ تو پہنچا تو صاحب مذکورہ کی طرف سے السلام علیکم یا نبی اللہ کہیں گے۔ آخر تمام صاحبان سے رخصت ہو کر اللہ کا نام لیکر **سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کُنا له مقرنین وانا اِلا ربنا لمنقلبون** ۔ پڑھتا ہوا ٹانگہ پر سوار ہو کر الوداعی السلام علیکم کہتا ہوا موضع باہتر سے حسن ابدال پہنچ کر میری خدمت حج کی کرنے کے لیے 25-5-50 کو حسن ابدال تشریف آور تھا اور حافظ غلام قادر صاحب ساکن لنگر بھی فقیر کو رخصت کرنے کے لیے حسن ابدال تک تشریف آور ہوئے۔ حسب القلب یظہر باللہ۔ میں نہیں کہ سکتا کہ حافظ صاحب اس وقت خوشی سے مسرور تھے یا کہ غم فرقت سے مجبور تھے۔ کبھی تو مجھ کو پسماندگان سے تسلی دیتے اور کبھی والی مدینہ کی طرف صلوٰۃ والسلام کا اتنا زور کر دیتے کہ خدا جانے ہمارے ذمہ اور

بھی کوئی کام ہے یا کہ نہیں ان پانچ مہینہ کے تھوڑے عرصے میں حافظ صاحب، کا صلوۃ وسلام ہی عرض کرتے رہیں گے۔ خیر میں کچھ نہیں تحریر کر سکتا کہ قلم کی طاقت سے باہر اور زبانی تحریر پر اس سے عاجز ہے۔ میں عجز وانکسار کی وہی شکل عرض کرنی ہے رسول اللہ ﷺ جانے اور اس کے قرآن شریف کا حافظ اللہ حافظ وناصر ہو اور بس پر سوار ہو کر حافظ صاحب و محمد اکبر غلام صادق سے رخصت ہو کر راولپنڈی شہر میں پہنچ کر مستری صاحب سے ملاقات حاصل کر کے 9:15 بجے کی ریل چناب ایکسپریس کے منتظر رہے اور عزیز غلام مرتضٰی ولد فضل احمد سے ملاقات حاصل ہوئی اور مستری فتح محمد سکنہ فتح جنگ سے جو فتح جنگ سے راولپنڈی تک اپنی ہمشیرہ کو رخصت کرنے تک آیا۔ آخر 9:30 پر ریل گاڑی چناب ایکسپریس پر سوار ہو کر الوداع کہ کر سب کو رخصت کیا۔ اللہ حافظ وناصر ہو۔

29 مئی صبح دس بجے کراچی سٹیشن پر پہنچ کر حجاج صاحبان سے شرف ملاقات حاصل ہوئی۔ حجاج صاحبان کا اسقدر ہجوم تھا کہ اسٹیشن کراچی شہر پر حاجی ہی حاجی نظر آئے مگر افسوس صد افسوس کہ ضلع کیمبل پور (موجودہ ضلع اٹک) کے حاجی صاحب کم نظر آئے۔ اللہ رحم وکرم فرمائے۔ البتہ ضلع مظفر گڑھ کے حاجی بکثرت نظر آئے جن میں ایک صاحب نے بارہ دفعہ حج کیا۔ اب تیرہویں (13) بار ہے جو کہ زیارت حرمین شریفین کی زیارت کو چلا اور کراچی کیمپ کو چھوڑ کر جہاز پر جتنی انہوں نے اپنے ہمراہیوں کی خدمت کی کہ ہسپتال سے دوائی اور روٹی پانی وغیرہ ہر طرح سے خدمت انجام دی۔ نیز ایک اور صاحب شیخ نیک صورت اور نیک سیرت جو کہ ____ سے ____ ہوئی جو کہ اُن کی زبان پر بغیر کلمہ اور ذکر اللہ و رسول ﷺ و دیگر بزرگ اہل سلوک سے اور کوئی لفظ نہ نکلتا تھا اور ہر وقت انکی طبیعت اپنے ہمراہ حاجیوں کی خدمت اور خوش اخلاقی سے پیش آنا ان کا کرشمہ ہے۔ چہرہ پر رعب، صورت خوشنما، شیریں زبان، فصح السان کشادہ جگر ان کا حصہ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو عطا فرمایا۔ اللہ جزائے خیر دیوے۔

صاحب موصوف نے اپنی سوانح حیات بیان فرمائی۔ عجیب وغریب صاحب موصوف کا اسم گرامی اللہ وسایا ولد یار محمد موضع سہرانی ضلع مظفر گڑھ ڈاکخانہ غازی گھاٹ کا باشندہ ہے۔ صاحب مال ہیں اپنی مال و جائیداد اپنے لڑکے کے حوالے کر کے سکول ماسٹر کی ملازمت میں اپنے حلال کی کمائی سے ارادہ حج

1949 میں کیا مگر بہت تکلیفات اُٹھانے کے بعد بھی کوئی صورت نہ بن سکی۔ آخر کار پانچ مہینہ کراچی میں بیٹھ کر مایوس ہو کر واپس وطن کو چلے گئے اور جانے کے بعد بہت عرصہ اس غم والم میں مبتلا ہو کر بیمار ہو گئے۔ فرقت رسول ﷺ بنی لیکن بعد از مدت ایک سال اُن کی مراد قلبی بر آئی اور 50ء کو اُن کو اجازت مل گئی اور گھر حکم گیا کہ تم آجاؤ۔ روپیہ پہلے والا 49ء اب داخل فیس کرایہ کر کے منظور ہے تو صاحب موصوف کلمہ طیبہ ورد اور الحمدللہ الحمدللہ کہتے کہتے راہی سفر سعید ہوئے ان کے ساتھ دو بھائی ایک حقیقی بھائی ولی محمد ولد یار محمد وقار بخش ان کے شہر کا باشندہ ہے۔ اللہ اُن کو جملہ تکلیفات سے محفوظ رکھ کر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پہنچا کر ____ دارِ نبی سے مشرف فرمائے۔ آمین ثُم آمین۔

ایک اور صاحب نوعمر قریباً قریباً 32,30 عمر کے سے ملاقات ہوئی جن کا اسم گرامی محمد افضل ہے اس شخص کو اسم با مسمیٰ پایا، جیسے کہ اس کا نام افضل ہے اس سے بڑھ کر افضل پایا اور دیکھا۔ ذہین پرلے درجے کا خلیق اعلیٰ پیمانے کا، تعلیم اُردو، انگریزی سے اچھا ماہر، چست وچالاک، ہر قسم کا بردبار اور کام کرنے والا دیکھا، زبان کا خوش خلق، قلم کا اعلیٰ درجے کا منشی طاقت خداداد کا جسم زور آور غرض ہر وصف میں موصوف ہے میری دُعا ہے کہ ایسے شخص کو جو خدمت خلق کو اپنی کسی ذاتی غرض سے مقدم سمجھ کر کرے اور دوسروں کو تبلیغ دلوئے۔ من ینفع الناس فھو خیر الناس۔ کے زمرہ میں اگر ہے تو یہ ایک شخص ہے اللہ تعالیٰ اُس کو دو جہان کی کامیابی اور سرفرازی نصیب فرمائے آمین ثُم آمین۔ جو خدمت حجاج عام بلکہ خاص کرنا واقف و واقف کہ دلداری وہمت براری سے سامان کا اُتارنا اور جہاز کا بندوبست اور بیمار کا پوچھ بھال اور دیگر خبر گیری کرنی اُس کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ جہاز کا سامان خردار نے ہی جہاز پر چڑھانا، اُترانا اور مال کی ڈھونڈ بھال کر کے جانفشانی سے احباب کے مال کی نگرانی کر کے تمام سامان اپنے مالک کے علیحدہ علیحدہ دینا اور خبر گیری کرانی اور دل کی تسلی کے لیے میٹھے میٹھے الفاظ، بسم اللہ، شالہ خیر ہووی، بچہ جیوی، منگ اور بھیڑ کے وقت استعمال کر کے دلداری کرنی یہ کوئی آسان بات نہیں اور نہ کوئی کر سکتا ہے۔

اس کے آگے اور کرشمہ ہے۔ مالک اپنے سامان سے غافل، سست اور تنگ ہو کر اس حد تک آگے جاتا ہے کہ ہائے میرے سے یہ کام نہیں ہوتا۔ ہم گھبرا جاتے ہیں لیکن یہ نہیں گھبراتا بلکہ مالک مال کو منت

سماجت لے جا کر سامان اُن کے ذمے کرنا۔ بلکہ بعض اصحاب نے اس بات پر مجبور کیا کہ تم اتنا کام نہ کرو فلاں فلاں احباب اہل سفر قدردان نہیں بلکہ بے جا بولتے ہیں اور تم ناحق اتنا مغزخوری اور مشقت سے لوگوں کے کام کر رہے ہو تو واہ وہ جواب یہ ہے کہ مجھ لطف آتا ہے کہ میں خدمت کروں اور دوسرا یہ کہ شکایت کرے۔ میں مدینہ کو جاتا ہوں۔ مدینہ کے لحاظ سے کر رہا ہوں یہ ان کا کام نہیں یہ مدینے والے کا کام ہے اس واسطے کہ یہ سرکار مدینہ کے مہمان ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شخص محبت اور عشق رسول ﷺ میں آ کر یہ خدمت حاجیوں کی کر رہا ہے۔

الحمدللہ کہ اللہ کریم نے اس کو بمع بال بچہ مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ تک لا کر سرکار مدینہ ﷺ کے دربار میں پیش کر دیا ہے اُمید ہے کہ جس کریم و رحیم نے یہ فضل رحم فرمایا، آئندہ کو بھی جملہ مقصود دینی و دنیوی سے سرفراز فرمائے گا۔ موصوف کے ساتھ ایک بچہ جس کا نام محمد اشرف ہے، عادات وخصلت میں بھی اشرف ہے جس کی عمر قریباً 16,15 سال معلوم ہوتی ہے اس کا ہمراہ حج کے لیے لے آئے ہیں اور اُن کے ساتھ اُن کی بی بی نیک فال اطوار معلوم ہوتی ہے اس واسطے کے جس کا مالک بھی حاجی فرزند بھی حاجی اور خود بی بی زائرہ بیت اللہ و حرم نبوی ہو اس سے بڑھ کر اور خوس نصیبی کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ ان تمام دوستوں کو خوش و خرم رکھے ان کا مکمل پتہ یہ ہے۔ محمد افضل اسرا موضع شینہ والا ڈاکخانہ کروڑ تحصیل لیہ ضلع مظفر گڑھ،اور ایک اور صاحب حاجی عطا محمد دوسری بار حج کو روانہ ہے بڑا فیاض اور خدمت گار شخص ہے۔ خدمت کا تو کوئی اندازہ نہیں مگر تھوڑا طبیعت کا پابند ہے حس وقت طبیعت میں قدرے رنجش آ جائے تو لہٰذا چڑھدا بھول جاتا ہے آگے کسی خاص مقام پر ان کا حال تحریر کروں گا ایک موٹر ڈرائیور اور ایک جدہ کے رہنے والوں کے ساتھ اُن کا ٹکراؤ ہوا مگر مزیدار مجھ کو بہت پسند آیا۔ اپنے موقع پر تمام حال تحریر ہوگا۔

غرض ایسے ایسے نیک لوگ سفر سعید میں ملاقات ہوئی جن کی چند دن کی ملاقات و خدمات اس پر مجبور کرتی ہیں کہ باقی تمام کام چھوڑ کر انہی کے وصف بیان کرتا ہوں۔ پر کیوں نہ ہو جن کی صفت قرآن میں خدا کرتا ہے کہ مال اور جان خدا کی راہ میں قربان کرتے ہیں۔ غرض جس وقت کراچی حاجی کیمپ میں پہنچے تو اس طرح کہ ہوائی جہاز والی کمپنی حاجی لوگوں کی خدمت کے واسطے آ گئے اور کہنے لگے کہ آرام سے

بیٹھو ہماری لاری آنے والی ہے تمھارا سامان اور تم کو بخوشی حاجی کیمپ پہنچا دیں گے۔ الحمدللہ کہ ایک آدھ گھنٹہ بعد لاری آ گئی اور حاجی صاحبان بمعہ سامان کے بہت ہی آرام سے حاجی کیمپ پہنچ گئے اور مکان مل گیا اور ہر ایک حاجی سے اس کا نام پوچھ کر دس دس بارہ بارہ آدمی کو ایک مکان دیا گیا جہاں کہ بخوشی حاجیوں نے اپنا وقت بسر کیا۔ نیا حاجی کیمپ نمائش کے نام پر بنا نزد مزار قائداعظم محمد علی جناح کے ہم ٹھہرے ہوئے اور پاسپورٹ بنانے اور ٹیکہ لگانے کے کام میں مصروف رہے دو ٹیکہ چیچک اور ایک ٹیکہ ہیضہ کا چھ دن میں کرایا گیا۔ ٹیکہ کے بعد معلّمی سعودی ٹیکس 260 روپیہ ایک آنہ مبلغ مذکور کی رسید وصول کر کے حاجی لائین سے ٹکٹ جہاز حاصل کر لیا۔ جو کہ کل رقم تین صد گیارہ روپے چار آنہ تفصیل ذیل سے ہے۔ ایک سو روپیہ گھر سے جو پہلا بذریعہ حبیب بنک راولپنڈی سے بھیجا گیا اور دو سو گیارہ روپے چار آنے کراچی میں داخل کر کے ٹکٹ وصول کر کے فارغ ہوا لیکن دو روپیہ پاسپورٹ کے حاصل کرنے کے وقت رسید کا اور اضافہ نہ دینا ہوتا ہے اس طرح کل رقم

	آنے	روپے
کرایہ راولپنڈی سے کراچی تک	8	23
معلّمی سعودی ٹیکس کراچی میں	1	260
ٹکٹ جہاز کراچی سے جدہ تک	0	311
پاسپورٹ کی فیس	0	2
حسن ابدال سے راولپنڈی تک		12
کل رقم		597-5

یہ کل رقم ضروری خرچہ ہے اور اس کے علاوہ حاجی صاحبان اپنی مرضی پر اخراجات کرنے کا خود ذمہ دار ہے۔ لازمی خرچہ یہ ہے۔ دو چار احرام ایک ایک کپڑا کفن کا ضروری ہے جو کہ ضرورت کے وقت

نرخ وقت وقت کا۔ فقیر کا تو مبلغ 2-17 روپے کا کپڑا خرچ ہوا اور باقی سامان تیل و مرچ و نمک و پیاز و دال مسور وغیرہ ہر قسم کا سامان لیا گیا جن کا خرچ جملہ قریب قریب 40 روپے آ گئے اور حاجی کیمپ سے غلہ گندم اور چاول ہر ایک آدمی کو دو من و چار سیر غلہ ملتا تھا جو کہ دس روپے فی من گندم اور چاول بیس روپے فی من کے حساب سے دو من غلہ گندم اور چار سیر چاول خرید کر مبلغ 22 روپے کا غلہ خریدا گیا تا کہ پانچ مہینہ کے عرصہ میں کام آ جائے۔

مورخہ 3-6-50 بحری جہاز پر بوقت 7:30 بجے سوار ہو کر آرام سے بیٹھ گئے اور ساڑھے نو بجے جہاز روانہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے منزل مقصود پر پہنچائے۔ سوار ہوتے وقت ''**سبحان الذی سخر لنا ھذا و ما کُنا لہ مقرنین**'' پڑھ کر سوار جہاز ہوئے۔ الحمدللہ کہ جہاز بڑے آرام سے 13-6-50 جدہ شریف پہنچ گیا۔ الحمدللہ کہ جہاز کی نسبت سے تکلیفات جونسی حاجیوں کو ہو جاتی ہے اُس سے اللہ تعالیٰ نے بہت سے حاجیوں کو بچایا۔ اور بعض دوستوں کو کچھ کچھ تکلیف بھی ہوئی مگر معمولی ہوئی اللہ کے فضل و کرم سے بخیریت جہاز خوشی سے 12-6-50 کو جدہ کے قریب پہنچا مگر ہوا کے مخالف ہونے کی وجہ سے رات کو جہاز ایک دو میل کے فاصلہ بندرگاہ سے باہر کھڑا رہا۔ 13-6-50 کی صبح کو بعد از کھانا کھانے کے معمول جیسا بندرگاہ پر آ پہنچا۔ الحمدللہ کہ جدہ کا بندرگاہ اس سال 1950 کو تیار ہوا ہے اور حاجی لوگوں کو بہت آرام ہوئی ہے ورنہ قرنطینہ وخرچ لانچ کشتی کا بھی مبلغ 49 روپے بھی دینے پڑتے مگر الحمدللہ کہ حاجی لوگ اس مصیبت سے بچ گئے۔ جدہ شریف جہاز اترتے ہی بڑی تپاک اور خوش آمدید کہہ کر معلم صاحب کے ایجنٹ وکیل مل گئے۔ کراچی میں وکیل و معلم و ایجنٹ کا معاملہ خوش اسلوبی، خوش طبعی اور خوش خلقی دیکھ کر انسان کی طبیعت اس قدر خوش ہو جاتی ہے کہ اپنے بھائی اور والدین بھول جاتے ہیں تا سواری جہاز و اُترتے جہاز تک بلکہ ہر ایک ایجنٹ معلم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ معتبر شخص امیر قافلہ جو ہو اُس کو کچھ نذرانہ بھی دے کہ حاجی صاحبان کو قابو کر لیویں، بلکہ بچشم خود دیکھا گیا یہ ایک وکیل صاحب محمد رمضان سکنہ کالا باغ ضلع میانوالی نے مبلغ ایک سو روپے فقیر کو دیا کہ یہ روپے بطور ضمانت دیتا ہوں بلکہ بعد کو صاف کہہ دیا کہ تمھاری تحویل میں 16 آدمی ہیں تو مبلغ ایک سو روپیہ لے لو اور ان کا امیر

قافلہ تم کو مقرر کرتا ہوں اور اُن کی معلّمی ہم کو دو لیکن اُس کی ایک دن بلکہ دو دن کی لاپرواہی یا عدم فرصتی سے دل گھبرا گیا اور ایک دوسرے صاحب شاہ صاحب ایجنٹ اور معلم صاحب محمد امیر عالم خود پہنچ گئے اور بعد منت و سماجت انہوں نے اپنی معلّمی کا وعدہ ہم سے لے لیا۔ ایک دوست کے مجبور کرنے پر ہم بھی راضی ہو گئے۔ اور دُعائے خیر و وعدہ کر لیا۔ چونکہ میرے دوست نے کافی فائدہ اُٹھایا اور ہمت کی ہم راضی تھے اس لیے کہ ایک مسکین حاجی کا کام ہوتا ہے بلکہ میرے خاص دوست فتح محمد ہیں کہ بس اسی ذریعہ سے فائدہ پہنچا۔

اکثر حاجی صاحب اپنے شرم و حیا کے پردہ میں آ کر یہ کام کرنا ممنوع قرار دیتے ہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ معلم سے پیسہ لیکر آپ نہ کھاویں بلکہ کسی مسکین کی امداد کی جائے یا کہ عام دوستوں پر تقسیم کی جاوے کوئی مضائقہ نہیں اس واسطے کہ اگر اپنی شرافت دیکھ کر معلم سے کچھ نہ لو تو معلم صاحب وہی معاملہ کریں گے جو کہ لینے والوں سے کریں گے۔ غرض جہاز سے اترتے وقت ایجنٹ اور معلم صاحب ایک جگہ میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے اپنے شاہانہ لباس میں خوش آمدید اور مرحبا کے نعرے لگا کر مصافحہ و معانقہ کریں گے۔ کہ تم حیران رہ جاؤ گے اور کہو گے کہ اگر ایسی مہربانی ہمارے ساتھ ہوئی تو ہم کو بالکل کوئی غم و فکر نہ ہو گا۔

بوقت مصافحہ پوچھیں گے کہ معلم کون ہے۔ جس وقت معلم کا نام لو گے تو رنگ اور چہرہ یکدم فق اور یکدم کہیں گے کہ جاؤ اور اگر کہو گے کہ فلاں معلم ہے اور وہی معلم و کیل معلم ہو تو چاند سا مکھڑا دکھا کر مرحبا اہلاً و سہلاً یا مرحبا کہہ کر گلے سے لگا کر کہیں گے کہ اس طرف جاؤ۔ اس طرف جاتے ہی ایک صاحب کھڑے ہوں گے جو تمھارا پاسپورٹ ہاتھ سے چھین لیویں گے اور ایک چھوٹی سی رسید تم کو دیں گے چار قدم آگے جاؤ گے تو رسید بھی تم سے زور سے لے لیویں گے۔ تم حیران ہو گے کہ پاسپورٹ بھی تم سے لے لیا اور رسید بھی یہ کیا معاملہ پیش ہو گیا۔ یہ تو ایسا معاملہ ہوا کہ پرندے کے پر اکھیڑ لیں اور پرندے سے کہیں کہ اُڑ جا۔ لیکن پرندہ کیا کر سکتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ پاسپورٹ کس واسطے نکالا۔ صاحب پاسپورٹ نکالنے اور پیش کرے بغیر جہاز سے اترتے ہی نہیں دیتے بلکہ جہاز میں ہی ڈاکٹر صاحب عربی ڈاکٹر سرٹیفیکیٹ کا معائنہ کرتے ہیں اور دو دو مہریں لگاتے ہیں کہ واقعی اُن کو ٹیکہ چیچک و ہیضہ لگا ہے یا کہ

نہیں۔جس کے پاس سرٹیفیکٹ ٹیکہ نہ ہو اُس کو اول تو پاسپورٹ ہی نہیں ملتا اور اگر کسی صورت سے ملے تو جہاز سے اترنے نہیں دیتے بلکہ پاس مکمل ہو کر حاجی کیمپ سے روانہ ہو کر ڈاکٹری سرٹیفیکیٹ حاصل کرنے کے بعد بندرگاہ پر پہنچ کر پولیس افسر بھی سرٹیفیکیٹ کا معائنہ کرتے ہیں اور مہریں لگاتے ہیں۔ غرض حاجی لوگوں پر کونسی مصیبت ہے جو کہ نہ پیش آتی ہو۔ ہر ایک افسر افسر ہے بلکہ ہر سپاہی بھی افسر معلوم ہوتا ہے۔اس واسطے کہ ایک تو حاجی صاحبان مسافر ہیں دوسرا اللہ کے راستے میں اور محبوب خدا کے سچے عشق میں مبتلا اور مجنون ہو کر جو اپنے اہل وعیال کی فرقت اور مالی خرچ اور بدنی تکلیف،سفر پیدل اور ریل کی تھکان، دن رات کا جاگنا، حاجی کیمپ کی مصیبت، زمین پر سونا اور جہاز کے ڈول جانے سے ڈانواڈول ہونا اور جی کا گھبرانا اور بخار، نزلہ وزکام ہر قسم کی بیماری میں مبتلا ہونا یہ تمام تکالیف جو کہ تحریر میں آئی اس کی علاوہ اور بھی قسم قسم کی مشقتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔الحمدللہ کہ تمام کام خوشی سے ان کاموں کو اپنے سر پر اٹھائے اور عشق رسول ﷺ میں مست ہو کر بے پرواہی سے کام لیتے ہوئے پرواہ نہیں کرتے۔**الحمدلله وما توفيقى الا بالله**

ایک اور واقعہ یاد آ گیا مخلوق خدا رنگا رنگ اور گونا گوں نظر آئی۔ واہ واہ خدایا تیرے رنگ۔ایک دن ہمارے کاغذ ایک دوست کی لاپرواہی بلکہ کم علمی اور ناسمجھی کی وجہ سے خلط ملط ہو گئے۔ چونکہ تمام کاغذات انگریزی میں تحریر تھے اور فقیر تو زبان انگریزی کا حرف بھی جاننے سے معذور و مجبور تھا۔ بلکہ بغیر لکیروں کے کچھ نہ سمجھتا تھا۔کوئی یار و مددگار اُس موقع پر نہ تھا کہ حیران و سرگردان ہو کر توکل خدا کر کے جو صاحب کہ تمام حاجی کیمپ کے افسر خان صاحب، نیازی صاحب، سے مشہور ہیں ان کے دفتر میں گھس گیا اور صاحب موصوف سے کام بھی تھا اور اُن کا کام صرف دستخط کرنا تھا اس لیے کہ ماتحت افسروں کا کام تھا کاغذات کو مکمل کر کے خان صاحب سے دستخط کرا کر ٹکٹ حاصل کرنا باقی تھا۔ چونکہ خان صاحب کو بجائے دستخط کرنے کے معمولی کلرک کا کام کرنا تھا بلکہ میں یقین سے کہتا ہوں کہ کوئی معمولی کلرک بھی اتنا کام نہیں کرے گا۔جس کی ذمہ داری بھی ہو وہ بھی کرنے میں سستی بلکہ انکار ہی کر دیتے ہیں۔خان صاحب موصوف کی فیاضی وراخوصلہ فر ئی کی قدر کر اُنے ور ن سے سبق سیکھنا ہر سان پر لازم ہے ور

ضروری فرض ہے کہ وہ شخص خدمت خلق ایسی کرے بلکہ میری اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے لیے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو جزائے خیر دے اور ہم کو اتنی ہمت اور طاقت نصیب کرے کہ ہم بھی خلق اللہ پر رحم محض خدا کی رضا کے واسطے کریں۔ (آمین ثُم آمین)

ہم سولہ آدمیوں کو علیحدہ علیحدہ فارم علیحدہ علیحدہ نمبر یعنی فی نفر کے تین تین کاغذ کل مجموعہ 48 کاغذات پراگندہ اور خلط ملط ہو کر پس و پیش کی ہوئی ایک دفتر کا دفتر پیش خدمت خان صاحب کے کیے۔ یہ میں نہیں کہتا کہ میری جراءت اور عقلمندی ہے کہ خان صاحب سے کاغذات درست کرائے بلکہ یہ کہنے پر تیار ہوں کہ اللہ کا فضل و کرم شامل حال تھا اور اللہ تعالیٰ نے یہ خیال دل میں ڈال دیا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اتنا رتبہ بلند دیا ہے اُمید ہے کہ اُس کو جگر بھی اتنا ہی بلند دیا ہوگا۔ چلو توکل خدا پر کرو اور اللہ رسول ﷺ کو یاد کر کے دفتر میں گھس جاؤ۔ توکلت علی اللہ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم زبان سے پڑھ کر خان صاحب کے نزدیک جا کر کھڑے ہوئے اور زبانی عرض کر دیں گے۔ آؤ صاحب ذرا میرا حال دیکھو کہ ہر ایک لفظ سے مہربانی اور شکریہ شکریہ ادا کرتا ہوں اور اپنا غرض ظاہر کرتا ہوں اور دل میں اللہ اور رسول ﷺ کو یاد کرتا ہوں دیکھ قدرت کا تماشا۔ ہمارے کاغذات کو خان صاحب دیکھ کر کہنے لگے کہ حاجی صاحب یہ تو ایک دفتر بن گیا۔کسی صاحب سے یہ کاغذات صاف کر کے لے آنا تا کہ میں دستخط کر دوں۔ ہمارے ذمے بہت کام ہیں اور تمام حاجیوں کے دستخط کرنے میرے ذمے ہیں۔ ہمارے کام میں بہت حرج ہوگا تو ہماری زبان سے یہ لفظ بے اختیار سرزد ہوا کہ آپ صاحب سے بڑھ کر کون صاحب ہوگا۔ آپ کو اتنا بلند درجہ عطا کرنا، یہی تو سبب ہے۔ بگڑے کام سنوارنے اور محتاجوں کی احتیاج کو سرلانا۔ آخر صاحب نے میرے منہ کو دیکھ کر کہا کہ جو کرو اور بیٹھ جاؤ۔ الحمدللہ کہ صاحب موصوف نے کل کاغذ علیحدہ علیحدہ کر دیئے اور دستخط کر کے کاغذات ہمارے ذمہ کر دیئے۔ **الحمدلله جزاه الله فى الدارين۔**

ایک اور صاحب دوسرے رنگ والا ایک چپراسی صاحب جو کہ معمولی تنخواہ لینے والا جس صاحب کو بولتے کچھ حقارت سے دیکھتے اور ہر وقت پریشانی پر پیچ در پیچ نظر آتے تھے۔ بہت دن تک فقیر دیکھتا رہا مگر آخر ایک دن صاحب مذمومہ کو بصد التماس و عجز کے ساتھ عرض نگار ہو کر میٹھے لفظ سے بول کر کہا گیا کہ

صاحب تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو کہ یہ کون صاحبان ہیں اور آپ ناجائز دھمکیاں کیوں دیتے ہیں میں اُمید کرتا ہوں بلکہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمھارے جیسے شخص کو ہر ایک حاجی ملازم رکھ سکتا ہے۔ یہ تمام مالدار، صاحب جائیداد اور شریف لوگ ہیں لیکن یہ اگر اپنے عشق میں دیوانے اور متوالے ہو کر آپ کی سخت بات کو برداشت کر کے اپنے مطلب حاصل کرنے اور وصال محبوب کی طلب کے لیے سر بدوش کھڑے ہیں تو تم کو کچھ انصاف کرنا لازمی بلکہ فرض ہے اور اگر حقیقت کو سوچو تو تم لوگ حاجی صاحبان کی خدمت کرنے کے لیے مقرر ہو اور اپنی حیثیت کو مدنظر رکھ کر اپنی شرافت سے کام لو ورنہ تنگ آمد بجنگ آمد کا معاملہ قریب قریب ظاہر ہو جائے گا اور ہمارے واسطے دروازہ فریاد کا کافی وسیع پڑا ہے۔ آخر میں خدا اور محبوب خدا کے مہمان جا رہے ہیں۔ تو یہ اگر امتحان میں پاس ہوں گے تو مبادا کہ آپ سے خدا بدلہ لینے کو تیار ہو جائے۔ تو کیا آپ کا بھی کوئی ذریعہ نجات ہوگا اور ہے؟ نہیں اور بالکل نہیں۔

الحمدللہ کہ صاحب موصوف کو سمجھانے سے سمجھ آ گئی اور آئندہ خوش اسلوبی اور خوش خلقی سے کام کرنے لگا۔

تو معلم صاحب یا کہ ایجنٹ عربی لباس میں آخر ہم کو حیران و پریشان کر دیتے ہیں اس واسطے کہ انسان خوش خلق اور خوش سیرت کس طرح دگر گونہ کی حالت پر رہے گا لیکن جس وقت پاسپورٹ اور رسید یں بھی واپس وصول کر لیں تو حاجی صاحب معلم صاحب کے آگے رہن بلکہ بیع ہو گئے۔ اب معلم صاحب تھوڑا سا وقت تکلیف کا گزار کر مزے سے چین اُڑاتے ہیں اور ناواقف حاجی دام میں پہنچ جاتے ہیں لیکن کیا کریں حکومت کا کام اور انتظام ہی یہی ہے حکومت کا کام معلم کرتا ہے معلم کا کام حکومت۔ یک نہ شد دو شد۔ معلم صاحب کا نالش حکومت سے کرو تو ایک جرم، حکومت کی فریاد معلم سے کرو تو دو جرم۔ لیکن دشمن یہ کند جو مہربان باشند دوست والا قصہ یاد آ گیا۔ کس قدر ناجائز ہوگا بلکہ سخت ناجائز ہوگا مگر کسی روایت میں ہے کہ غیبت ظالم جائز ہے تا کہ لوگ ظالم کے ظلم سے باخبر ہو کر ظلم سے بچ جاویں۔ جدہ شریف پہنچ کر پاسپورٹ دیکر سامان سنبھالنا پڑتا ہے جو سامان حاجی صاحب کے اپنے پاس ہوتا ہے وہ کیمپ سے ہی حاجی صاحب سنبھالنا شروع کر دیتے ہیں بلکہ اپنی دسترس میں کر کے اپنے اپنے معلم کی طرف لاری / بس کرتے ہیں اور معلم کے مکان پر پہنچاتے ہیں۔ دو دن حاجی صاحب کو کرایہ دینے کے

واسطے ملتا ہے۔ واپسی دن سے کہ سامان سنبھال لیویں۔ دو دن کے بعد فی رات ایک ریال کرایہ دینا پڑے گا۔

واہ واہ انصاف ایک رات، ایک ریال۔ زیادہ تو نہیں لیتے اور غلہ وغیرہ دوسری جگہ سے گودام وغیرہ سے لینا پڑتا ہے۔ ضروری ہے کہ نام مالک اور معلم معلوم ہو ورنہ گم ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ جدہ شریف میں زیارت جدہ، صاحبہ بی بی حوا کے متصل سعودی بینک ہے جو کہ حاجی صاحب بکثرت زیارت کو جاتے ہیں لیکن مسلمان بادشاہ سعودی کا خوب انتظام ہے دروازہ کو مقفل کر کے دربان سپاہی عسکری ہر وقت موجود رہتا ہے اور زیارت کے قریب نہیں جانے دیتے۔ بادشاہ اسلام کا شعائر اسلام بلکہ پہلا رکن اسلام، کلمہ اور نماز سے پہلے پہلے یہی ہے کہ زیارت سے زائرین کو بند کیا جاوے اور قریب قبر ممنوع ٹھہرایا گیا۔

واہ اسلام، واہ اسلام کی سلطنت یہ تو عبدالوہاب کی سنت نظر آتی ہے اور کچھ نہیں۔ خیر کچھ بھی ہو حاجی صاحب دور دراز سے جا کر دیوار سے چوطرفہ گھوم گھوم کر کہیں ایسا مقام ڈھونڈ کر پا لیتے ہیں جہاں قبر کا مقام دور سے معلوم ہوتا ہے اور فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور **الحمد** ، **قل هو الله احد** پڑھ کر فاتحہ خوانی کر کے ثواب دارین حاصل کرتے ہیں۔

میں کہنے کو تیار ہوں کہ جس طرح ہمارے پنجابی پرستش قبر کرتے ہیں جاہل لوگ، یہ سراسر غلط اور ممنوع کام ہے مگر جو سختی اور تشدد آل سعود نے کر رکھا ہے یہ بھی کوئی انصاف اور شعائر اسلام نہیں۔ اس لیے کہ میں اس کے ثبوت میں ایک واقع جنت البقیع کا عرض کروں گا جو کہ آپ کو ماننا پڑے گا۔ یہ لفظ خوب یاد رکھنا چاہیے میں بھول گیا ضروری بلکہ اشد ضروری ہے کہ حاجی کیمپ سے اپنے سامان پر اپنا نام اور ضلع اور معلم کا نام درج کرنا کوشش کریں کہ لکھوا دیں تو سامان گم نہیں ہوتا ورنہ حکومت پر گلہ کرنا فضول ہوگا۔ اگر نام اور مکمل پتہ ہو تو یقینی ہے کہ سامان مالک کو صحیح و سلامت مل جاوے گا اور اگر نام مالک اور معلم نہ ہو تو اگر گودام میں چلا گیا تو حکومت کوئی ذمہ دار نہیں اور وہ مال تصور حکومت اور مفقود مال ہو کر بیت المال میں جمع ہو جائے گا۔ یا تو آپ کو قسم کرنی پڑے گی اور پختہ نشان بتانا پڑے گا تو اس لیے پہلے سے معمولی سی تکلیف تحریر والی گوارا کر کے تمام مصیبت سے رہائی حاصل کریں۔ البتہ یہ ضروری بلکہ اشد ضروری اور قابل تسلیم بات ہے اور انصاف سے کہنا پڑتا ہے کہ جدہ شریف، مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ میں

چوری کا نام نہیں سنا، ہمارے ملک میں معمولی جلسہ گاہ ہو، نیز عمومی ہجوم میں کپڑے اور جوتے اور روپے وغیرہ غرض جس قسم کا سامان چوری ہوتے رہتے ہیں لیکن الحمدللہ کہ مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں کوئی شکوہ چوری کا نہیں سنا۔

غرض ہم تمام ہمراہی اپنے سامان اور خود بخوشی تمام جدہ شریف سے روانہ ہوکر 50-6-15 کو مکہ مکرمہ شب جمعہ کو پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج صبح یوم جمعہ رمضان شریف شروع ہو رہا ہے اور چاند دیکھ کر اول رمضان شریف شروع ہے۔ ہم حیران ہوگئے کہ ہمارے ملک میں تو غالباً اتوار تک رمضان شریف شروع ہوگا لیکن خیر معلوم ہوگیا کہ مطلع ہر ایک ملک کا علیحدہ علیحدہ ہے جو کہ مکہ معظّمہ سے بوقت خط و کتابت اپنے احباب کو عجائبات کے طور پر تحریر کیا گیا کہ مکہ مکرمہ میں یکم رمضان شریف 50-6-15 بروز جمعہ شروع ہے اور تم اپنے ملک کی اطلاع دو تو بعد کو جوابی اطلاع موصول ہوئی کہ پاکستان کے علیحدہ علیحدہ صوبہ جات صوبہ مغربی پنجاب، صوبہ سرحد میں یوم یکشنبہ سے رمضان شروع ہے۔ الٰہی قدرت کا کرشمہ ہے۔ جمعہ کا دن گزار کر کریم رمضان بوقت افطار کے دوست مجھے بھی اشارہ کیا تو بفضل خدا جمعہ گزار کر آمدرات شب کو فقیر جن کی نظر اس قدر کمزور ہے کہ دوسرے تیسرے دن کا چاند دیکھتا ہے اس دن چاند دیکھا تو یقین سے معلوم ہوتا ہے کہ رات اور دن اور مطلع میں بڑا فرق ہے چونکہ مکہ اور مدینہ میں افطار پورے 12 بجے اور سحور 8:15 بجے پورے ٹائم پر ہوتا ہے۔ صاحب عقل خود سوچ کر اندازہ لگا لیوے۔ مکہ معظّمہ میں پہنچ کر پہلی سحری کے وقت دعوت معلم سے خوب سیر ہو کر روٹی کھائی اور بعد از سحور فارغ ہو کر طواف سے فارغ ہو کر صفا و مروہ کر کے صبح کی نماز پڑھی۔ الحمدللہ اُس ذات کا ہے کہ اس گنہگار کے حال پر رحم فرما کر اپنے گھر پاک کا طواف کرایا۔ دوستو میں کیا عرض کروں جس درد بھری آہ و زاری فریاد بارگاہ باری میں میرے دوست حاجی صاحبان کرتے تھے۔ سبحان اللہ کیا تعریف کروں زبان پر **لبیك اللھم لبیك لا شریك لك لبیك** ہے اور دل میں خوف خدا اور ذوق وشوق وجذبہ بیت العرب ہے۔ بے ہوشی کی حالت اور مستی کی صورت معلوم ہوتی نہ جانے کہ تلبیہ صحیح ہے یا کہ لفظ کمی بیشی کے نکلتے ہیں لیکن بفضل خدا الحمدللہ کے شوق اور بیت میں اس

قدر مست تھے کہ تحریر سے باہر ہے جو پیش کی جاوے اس واسطے کے العشق نار یحرق ماسواللہ کا معاملہ ہے۔ غرض جوں جوں بیت اللہ کو قریب ہوئے اپنے گناہوں سے نادم اور پریشان ہو کر اور اللہ کے احسان کو یاد کر کے اتنا گڑگڑاتے اور روتے تھے۔ غرض طواف کے بعد جس وقت صفا و مروہ کو گئے تو قصہ بی بی ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ کا یاد کر کے اور ابراہیمؑ کی دعا کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ خیال دل میں آتا اور شکر خدا ادا کر کے صفا و مروہ سے فارغ ہو کر نماز پڑھ کر حجامت کرا کر احرام کھول دی۔ چونکہ موسم گرما ہے اور رمضان شریف کا مہینہ ہے اس لیے باقی معلومات سے ناواقف مگر عرض ہے کہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک بغیر طواف اور مسجد عمرہ کے جانے اور عمرہ کرنے کے اور کوئی حالت ایسی نہ ملی جو کہ تحریر میں لائی جاوے۔ یہ تمام بعد از قابل تحریر ہے کہ صبح کے وقت جس وقت تلاش مکان میں بذریعہ عبداللہ معلم برادر محمد امیر عالم وکیل کے پھرنے کو کوئی اٹھانا پڑے گا۔ جس فائدہ کی امید تھی اُس سے دگنا خسران اور ذلت اٹھانی پڑے گی۔ فکر کرو۔ غور کرو۔ سوچ کرو۔ ہوشیار رہو محبوب خدا کا دربار ہے۔ **لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی** سے بچو ایسا نہ ہو کہ معاملہ اُلٹ پڑے۔

آؤ آؤ دوستو بے فکر ہو کے آؤ یہ دربار کبریا ہے یہ بارگاہ رحمت اللعالمین ہے۔ ہر قسم کی معافی دینے والا اور دلوانے والا ہے۔ ذرا اتنا ہو کہ دربار رسالت میں تیری محبت سرکار دو جہاں کی عقیدت مندی میں فرق نہ ہو، خطا معاف کرنا اور کرانا اسی کا نام اور اسی کا کام ہے۔ واہ رے جو ذات اقدس پہاڑ کے سر پر ایک غار میں تین دن تک لوگوں سے روپوش ہو کر خدائے برتر سے تیرے گناہوں کی معافی مانگ رہا ہے اور لوگ تین روز تک ڈھونڈ بھال میں مصروف ہیں اور نبی اکرم ﷺ اس گنہگار اُمت کی معافی گناہ کے لیے سربسجود ہو کر التجا بارگاہ ربی میں کر رہے ہیں کہ اے رب رحیم و کریم میری گناہ گار اُمت کو معاف دے اور رحم و کرم ادھر اصحاب بے قرار ہر طرف دوڑتے پھرتے ہیں اور ڈھونڈ بھال کر کے کسی اعرابی چرواہے سے پتہ چلا کہ میری بکریاں آج تیسرا دن ہے کہ گھاس نہیں کھائی اور خاموشی کی حالت اور فکر و دلگیری کی صورت میں اس غار کے قریب آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں سبحان اللہ، دیکھو شان محمدی، جس وقت اصحاب غار کے قریب پہنچے اور ہجوم صحابہ کرام بمعہ حضرت بی بی فاطمہ الزہرا خاتون جنت بھی اپنی

تکلیف وخوشی سے معمول کی حالت کو بدل کر وہاں پہنچے تو بارگاہ الٰہی سے ندا آئی کہ اے محمد ﷺ سر اٹھا کیوں نہ ہو جس وقت سردار دو جہان کی لڑکی بضعۃ الوریٰ نے سر بسجود ہونے کی کوشش کی تو قدرت کو تماشا اور حیرانگی آگئی کہ میں رب رحیم ہوں اور محمد ﷺ اور فاطمہؓ دوکس ایک اُمت کے لیے معافی نہیں مانگیں گے اس واسطے کہ محمد ﷺ کو تو ضرور امت کی پاسداری ہے اور اُمت کو بخشوائے گا۔ جب اُمت بخش دی جائے گی تو رحمت للعالمین کی لاڈی اگر منکرین خدا کے لیے سوال کر دیوے اور کہہ دیو کہ میرا بابا رحمت للعالمین بھی ہے تو اللہ تو تمام عالمین کو بخش دے تو ضروری بخشنا پڑے گا۔

اس لیے فاطمہؓ کے پہنچتے ہی جبرائیلؑ حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ اے محمد ﷺ سر اُٹھاؤ تمھاری تمام گناہ گار اُمت بخش دی گئی۔ الحمدللہ الحمدللہ الحمدللہ۔ دوستو میں کچھ دیوانہ سا ہوں، عقل کام نہیں کرتا، موقع بے موقع کے بغیر سوچ سمجھتے ایک مضمون سے دوسرے مضمون کو پکڑ لیتا ہوں معافی کا خواستگار ہوں۔ غار سعد اب بھی موجود ہے اُس پر نشان بھی موجود ہے عرض مفصل کروں گا منکرین کو شیشہ کی طرح سامنے نظر آجائے گا۔

مندرجہ بالا چند سطور سے پہلے عرض کی گئی کہ سوچو عرض یہ کہ مسجد حرم عالیشان مکان ہے ایسا نہ ہو کہ مکان کی زیب وزینت کو دیکھتا رہے اور قندیل وشمع دان کی طرف نظر پھر جائے اور اصلی مقصد اور مطلب فوت ہو جائے۔ حاشا وکلا ہرگز اُوپر نہ دیکھو۔ دربار عالیہ کے سامنے ہوتے ہی جس دروازہ سے آؤ جہاں تیرا مقام یا قیام ہے آؤ، پرواہ نہیں صرف یہ ضروری ہے کہ جس وقت دروازہ پر پہنچو تو اپنے دل میں فکر کرو کہ آیا مجھ کو حضور پر نور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مالک لولاک اندر دربار میں حاضری اور داخل ہونے کی عنایت کرتے ہیں یا کہ بلا تامل اور بغیر سوچے سمجھے ایک معمولی تحصیلدار کی کچہری اپنی حیثیت سے بھی سمجھ کر اندر جاتا ہوں کیونکہ عمومی افسر کے کمرہ عدالت میں جس وقت انسان جاتا ہے تو ہزار فکر سے اندر کو پاؤں رکھتا ہے کہ مبادا اندر سے آواز آجائے کہ اندر مت آؤ اور باہر ہی کھڑے رہو پھر بلاؤں گا۔ ذرا اتنا تو سوچو میرے ملک پاکستان میں میری تھوڑی سی عمر میں میں نے کچھ حصہ بادشاہوں کی بادشاہی یاد ہے جن کی ضرب (سکہ) آج بھی کسی مالدار شخص کے پاس مل جاتا ہے جو کہ ناکارہ ثابت ہوا پڑا ہے۔

انگریز کے زمانے میں پہلا 40ء والا جو کہ مکہ معظّمہ کا روپیہ پھر ایڈورڈ جو کہ روڈا اور مہیب شکل کا تھا اور پھر جارج پنجم تاج والا اور پھر جارج ششم جس پر بادشاہی ختم ہو کر پاکستان قائم ہو گیا اور پاکستانی ضرب چل گیا۔ اللہ تعالیٰ قائم رکھے اور انگریز کو کبھی اس ملک پر مسلط نہ کرے۔ آمین۔

غرض پانچ قسم کی ضرب (سکہ) میں نے دیکھی ہیں ایک بادشاہ مر گیا تو دوسرے کا ضرب (سکہ) مل گیا اُس کی شکل اور اُس کی تصویر کس کوئی چند دن تک حکم ہو جاتا کہ فلاں ضرب بے کار ہو گئی ہے اس کو داخل کرو ورنہ کل کو بند ہو جائے گی اور پھر تم افسوس کرو گے اور ہوتا بھی اسی طرح رہا تجربے سے ثابت ہے۔ آؤ اصل مسئلہ کی طرف غور وفکر کرو۔ ہجری سے پہلے ضرب (سکہ) عرب کے مشہور شہر مکہ معظّمہ میں چلی جو کہ بعض نہ بلکہ بہت اور اکثر لوگوں نے کوشش کی کہ یہ ضرب (سکہ) ہرگز نہ چلے گی۔ اور ہم کوشش کریں گے کہ بادشاہ اور یہ ضرب مٹ جائیں گے لیکن تماشا دیکھو یہ کس زور شور سے ضرب چلی، مٹانے والے مٹ گئے اور جو نہ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ الحمدللہ کونسی ضرب ہے بتاؤ تو سہی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اس ضرب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ بڑے بڑے منکرین مٹانے اور دنیا سے نام اور کام محمد ﷺ کو گمانے (گم کرنے) کے واسطے رات دن عمر بسر کر دی اور کوشش کی مگر احکم الحاکمین قادر کریم کا وعدہ ہے کہ یُریدون لیطفو نور اللہ با فواھم واللہ یتمُ نورہ ولو کرہ الکافرون۔

آج قریباً چودہ سو سال تک اسی بادشاہ کی ضرب ہر ملک میں چل رہی ہے اور تا قیامت چلے گی تو کیا جو بادشاہ اتنی طاقت کا مالک ہو جو کہ دنیا سے روپوش ہونے کے بعد بھی اتنی طاقت رکھتا ہو کہ اُس کے نام کی ضرب چلے اور چلتی جائے گی تو اُس سے کیوں فکر اور غم نہ کریں۔ ضرور ادب کا لحاظ کرتے کرتے خوف کا مقام بھی کرنا پڑے گا۔ اول حاضری مسجد شریف میں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھ کر دربار رسول ﷺ میں حاضر ہوا یہ یاد رکھو کہ اگر معلم ہو تو خود بخود بتلا دے گا اور اگر معلم نہ بتلاوے تو پُوچھ لینا بہتر ہے۔

دُعا کرنے کی جگہ: روضہ اقدس کے تین دروازے جالی دار معلوم ہوتے ہیں ناواقف کو معلوم نہیں ہوتا کہ کونسا دروازہ اور قبر رسول ﷺ کے نزدیک ہے۔ اس لیے اپنے آپ کو واقف کرنا ضروری ہے۔ مسجد کی طرف جو دروازہ جالی دار ہے یہ بھی خالی جگہ ہے اور مشرق کی طرف جو دروازہ ہے یہ بھی خالی جگہ

ہے۔ روایت ہے کہ عیسیٰؑ کے نزول کے بعد مدفن ہوگا اور مغرب جائے نزول جبرائیلؑ۔ غرض درمیانہ دروازہ جالی دار جو ہے اُس کے قریب کھڑے ہوکر جو ایک طشت زریں کی طرح ایک سوراخ دار طشت جالی سے چپکا ہوا ہے جس کا سوراخ بھی 15:8 انچ تک مدیر شکل کا ہے اور باقی اُس سوراخ سے چھوٹے سوراخ اور طشت بھی چھوٹے ہیں۔ بہر حال درمیانہ دروازہ بڑا طشت بڑی سوراخ والی کے قریب ہوکر السلام علیک یا رسول اللہ ، السلام علیک یا حبیب اللہ پڑھ کر دعا کرو۔ اول تو معلم صاحب دُعا پڑھتا جاوے گا اور آپ بھی اُس کی تعلیم میں رہ کر سلام علیک اور دعا پڑھو اور دُعا ختم کر کے ایک قدم دائیں ہاتھ پر پیچھے ہٹ کر حضرت صدیق اکبرؓ کی قبر کے سامنے کھڑے ہوکر اسلام علیکم کہہ کر الحمد للہ اور قل ھو اللہ احد کے بعد دعا کر کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کی خدمت میں اس طرح ایک قدم ہٹ کر اسلام علیکم یا خلیفہ المومنین سے عرض پرداز ہونا چاہیے۔

جو شخص کہ تعلیم یافتہ ہے اس کے واسطے علیحدہ علیحدہ دعا درج ذیل ہے جو شخص تعلیم یافتہ نہ ہو اُس کے اپنی زبان ہندی ، اُردو ، پشتو ، فارسی ہی کافی ہے لیکن حضوری اور خشوع اور درد و گریہ وزاری اور عاجزی لازم ہے۔ دعائیں قسم قسم متفرق صورت پر ہیں جو کہ ہر ایک شخص نے تعداد وسعت اور طاقت اور محبت کے علیحدہ علیحدہ دعائیں لکھنی ہیں یعنی ہر حج کے ایام میں صفت اور قیمتاً بھی حاجی صاحبان کو ملتی ہیں جو ہر ایک صاحب اُن سے فیض حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ کچھ علم رکھتا ہو اور جو شخص علم سے بے بہرہ ہو اُس کو قدرے تکلیف ہوگی۔ یا تو معلم کی ضرورت پڑے گی یا اپنے کسی دوست سے طریقہ دعا سیکھ لے تاکہ دقت نہ ہو۔

فضائل زیارت مدینہ منورہ:

1: زیارت رسول کریم ﷺ اہم ترین نیکیوں میں سے نیکی ہے بلکہ بعض علمائے اہل وسُنت کے واسطے واجب لکھا ہے جب افضل اور رشد ترین اور ثواب میں بکثرت روایات حدیث صحیح ثابت ہیں تو پھر کیا جھگڑا باقی رہا جو شخص کہ وسعت حاضری رکھتا ہو اور ما خرنہ تو بڑی غفلت کی بات ہے۔

2: حضور سرورِ عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے واسطے میری شفاعت واجب ہوگئی۔

3: حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص حج کرے اور پھر میری قبر کی زیارت کرے گا جیسے اُس نے زندگی میں میری زیارت کی۔

4: حضرت امام احمد نے حضور ﷺ کی یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ جو شخص قبر کے پاس گزرے اور اُس پر سلام پڑھے تو میں اُس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

5: حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص مدینہ میں آ کر میری زیارت ثواب کی نیت سے کرے (یعنی اور کوئی غرض نہ ہو) وہ میرے پڑوس میں ہوگا اور میں قیامت کے دن اُس کا سفارشی ہوں گا۔

6: حضور کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص حج کے لیے مکہ جائے پھر قصد کر کے میری مسجد میں آئے اُس کے لیے دو حج کا ثواب مقبول حج کا ثواب کہا جاتا ہے۔

7: حدیث سے ثابت ہے کہ جس نے حج کیا اور حضور معلم کی روضہ اطہر کی حاضری کی سعادت حاصل نہ کی اُس نے حضور پر ظلم کیا۔ (تو معلوم ہوا کہ اُس پر حضور ﷺ ناراض ہوں گے)۔

حضور ﷺ کے روضۂ مبارک اور مسجد نبوی کے ممبر کے درمیان جو حصہ ہے وہ ریاض الجنتہ کہلاتا ہے۔
بحکم حدیث۔ درمیان گھر اور منبر کے روضہ ہے ایک ریاض جنت ہے۔ الفاظ حدیث شریف یہ ہیں۔
ما بین بیتی ومنبری روضہ فی ریاض الجنتہ۔ یہ ریاض الجنتہ نفل نماز بلکہ فرض واجب جو ہو اور تلاوت کلام پاک اور درود شریف اور وظائف پڑھنے کے واسطے بہت قابل قدر حصہ ہیں اس موقع کو کبھی بھی ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ ضرور کوشش کرو کہ فرض نماز اور نفل عبادت بھی اسی میں کریں آپ کو خود بخود فیض کا پتہ معلوم ہو جائے گا۔

محراب نبوی نوافل پڑھنے کے واسطے نماز صبح کے بعد دو تین گھنٹے تک انتظار کر کے نفل پڑھنے کا بہترین موقع ہے۔ تو مناسب بلکہ افضل طریقہ یہ ہے کہ سلام کے بعد مواجہ شریف میں قبلہ رخ ہو کر دعا

کریں اور دعا کے بعد آ کر محراب نبوی میں دو رکعت نفل تحیۃ زیارت رسول ﷺ پڑھیں اور اثر اور برکت کا تماشہ دیکھیں۔

9: قیام مدینہ منورہ میں مواجہ شریف میں درود شریف کی کثرت بڑی خیر و برکت کی چیز ہے۔

10: قیام مدینہ میں اگر ہو سکے تو بعد از اشراق مسجد قبا میں جا کر نفل ادا کرے اور عمرہ کا ثواب حاصل کرے اور وضو گھر سے کر کے جائے اور اگر روز نہ ہو سکے تو شنبہ یا کہ دوشنبہ کو ضروری ہے اور 23 رمضان اور 27 رمضان کو ضرور ہی جانا چاہیے۔

11: حضور کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے میری مسجد یعنی مسجد نبوی میں چالیس نمازیں ادا کر لیں اور کوئی نماز قضا نہ کی تو وہ نفاق اور جہنم کے عذاب سے نجات پائے گا۔ الحمد للہ، الحمد للہ، الحمد للہ۔ اس فقیر نے 28 دن یعنی 20 دن رمضان شریف اور 8 دن شوال المکرّم کے خاص حصہ مابین سبز و بیت حضور خاص کر کے استوانہ ابی لبابہ کے پاس نماز فرض و نوافل ادا کی تو الحمد للہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

فقیر نے تو "السعی منی والاتمام من اللہ" کے مطابق اس لیے کوشش کی اگر اس استوانہ کے ساتھ اپنی جان باندھنے سے اپنے گناہ معاف کرا لیا تو اُمید ہے کہ مولا کریم اپنے فضل و کرم سے ایک نظر رحمت کی کر کے دریائے رحمت سے اس گناہ گار کو بھی بطفیل حبیب کبریا محمد مصطفے ﷺ گناہ کی معافی دلوئے۔ آمین ثُم آمین

مسجد حرم نبوی کے پانچ دروازے ہیں جن کے نام حسب ذیل ہیں۔ باب الرحمت، باب مجیدی، باب النساء، باب جبریل، باب السلام اور پانچ ہی مینار ہیں جو کہ اپنے اپنے دروازوں سے مشہور ہیں۔

مسجد حرم تو بہت وسیع جگہ ہے جس کا حدود اربعہ اور ستون کا اور اندازہ نہیں کیا مگر الحمد للہ مسجد کے حصے اپنے اپنے نام سے مشہور اور نشانات موجود ہیں، مسجد نبوی، مسجد امیر عمر، مسجد عثمان، مسجد سلطان عبدالحمید خان جو کہ ستونوں کے علیحدہ علیحدہ نشانات ہیں اللہ تعالیٰ ہر ایک کے بانی کو جزائے خیر دے۔ مسجد نبوی میں نماز ہر جگہ پڑھنی موجب فلاح دارین ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو ہر وقت

طاقت نصیب کرے کہ جنہوں نے ایک بار چالیس نمازیں ادا کیں اور بعد حسرت و افسوس سعودی سلطنت کے ظالمانہ حکومت سے روتے ہوئے الوداع یا رسول اللہ الوداع یا حبیب اللہ کہتے کہتے چلے آئے۔ واہ واہ واہ

مقامات مقدسہ مدینہ منورہ میں قابل زیارت جو کہ تمام حاجی و زائرین صاحبان زیارت کرتے ہیں اور دعا و نوافل وہاں پر موجب ثواب سمجھ کر پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ اللہ ان پر رحم و کرم فرمائے۔ مسجد قبا جس میں جا کر نفل ادا کرنے پر عمرہ جیسا ثواب ملتا ہے۔ مسجد قبا اول مدینہ کے نام سے مشہور ہے جہاں پر حضور سرور عالم ﷺ نے پہلے جا کر قیام فرمایا اور بعد کو مدینہ تشریف لے گئے۔ یہاں پر مسجد کے قریب بیت فاطمہؓ اور بئر فاطمہؓ بھی موجود ہیں جس کا پانی پینا موجب خیر و برکت ہے۔ مسجد قبا کی مشرقی طرف باغات میوہ جات کھجور، انگور و انجیر و سبزی ہر قسم کے بکثرت ہیں اور باغ سے کچھ تھوڑا گزر کر باغات کے درمیان مسجد شمس موجود ہے۔ یہ وہ مسجد شریف ہے کہ جہاں حضرت رسول اکرم ﷺ آرام گزیں بوقت عصر کہ ران مبارک حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر سر رکھ کر راحت فرمائی اور شمس غروب ہو گیا اور نماز عصر علی حیدرؓ کی فوت ہو گئی تو حضرت سرور کونین ﷺ بیدار فرحت آثار ہو کہ جو چہرہ مبارک علیؓ پر نظر پڑی تو چہرہ اقدس حیران و پریشان نظر آیا تو پوچھا علیؓ یہ کیا حالت ہے خنداں بھی اور گریاں بھی حضرت حیدر کرارؓ نے جب نماز کا واقعہ سُنایا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے بیدار کر دیتے اور نماز پڑھ لیتے تو عاشق رسول ﷺ نے عرض کی کہ خدا کو راضی کرنا اور خدا کے محبوب کو تکلیف دینی اور محبوب خدا کے بے آرام کرنا یہ بھی خلافت عقل معلوم ہوتا ہے میں نے تو اس واسطے نہیں کیا کہ مبادا کہ خدا کو اپنے اس محبوب کی تکلیف گوارا کرنا پسند نہ آئے اور مجھ پر ناراض ہو جائے تو کیا جواب دوں گا الغرض جب چچازاد بھائیوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی تو جبرائیلؑ نے نازل ہو کر فرمایا کہ اے محمد ﷺ دیکھ شمس کہاں کھڑا ہے اور وقت عصر باقی ہے مولا کریم فرماتا ہے کہ اگر علیؓ قیامت تک نماز ادا نہ کرے تو یہ شمس قیامت تک کھڑا رہے گا۔

واہ واہ واہ رسول معلم، واہ واہ واہ علی کا ایمان اور محبت رسول اور واہ واہ واہ قدرتِ احکم الحاکمین رب العالمین، سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

اسی مسجد شمس کے قریب خاک شفا ہے جو کہ بوقت جنگ، اصحاب جو شہید ہوئے اور جو زخمی ہوئے ان کے زخم کا علاج کرتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر یہ خاک شفا کسی زخم پر لگائی جائے تو شفائے کاملہ نصیب ہوتی ہے تو صحابہ کرام نے جس وقت خاک شفا اپنے زخم مبارک پر ملی تو جملہ صحابہ کو شافی نے شفائے کاملہ بخشی جو کہ آج تک سلف صالحین سے متاخرین تک کے تجربے سے ثابت ہے اور ہوگئی ہے اور ایک مقام اقدس بعد از روضہ رسول ﷺ مشہور اور معروف بزیارت، زائرین صاحبان موجود ہیں جن کا ذکر کرنا ہی اہم ترین اور ضروریات سے ضروری ہے۔

جنت البقیع:

جنت البقیع وہ مقام ہے جس کی شان میں احادیث تواتر سے برائے فضیلت ثابت ہیں۔ خاص کر جس وقت سے حضرت عثمان بن عفانؓ کا ورد مسعود ہوا تو جنت البقیع کا مرتبہ اس سے کہیں بڑھ گیا۔ لیکن آج مقام افسوس صد افسوس ہے بلکہ از حد باعث رنج و ملال ہے جو کہ مندرجہ ذیل حالات سے واقف ہو کر ہر ایک صحابہ، بصیرت نظر انصاف کریں کہ یا تو وہ وقت تھا کہ جنت البقیع ظاہری صورت میں جنت نشان بسبب روضہ اقدس حضرت عثمانؓ و آل بیت طاہرین و حضرت ابن عباس و امہات المومنین کے روضات المقدس جابجا موجود تھے اور جنت البقیع کا نظارہ ظاہری صورت میں خوش نما تھا اور آج کل روضہ مطہرین گرا کر مسمار کر دیئے اور پتھر کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں اور قبر کے نام مقدس یا کہ نشان موجود ہیں۔

الحمد للہ اس پر بھی کہ سعودی سلطنت نے قبے گرانے کی بجائے قبریں بھی نہ اکھیڑ رکھیں ورنہ حکومت کے اقوال وافعال کو دیکھ کر ضرور کہنا پڑتا ہے کہ جو کام یزید بن معاویہ نے کیے اور جو افعال ظالمانہ حجاج بن یوسف سے سرزد ہوئے ہیں کہ جن کی تواریخ جابجا اور ہر گوشہ شاہد ہو کر نالہ و گریاں ہے اس منصف مزاج اور نیک طنیت عبدالعزیز ابن سعود نجدی کے حکم اور حکومت کو غور سے فکر کرو، فکر کرو، ضرور کہنا پڑتا ہے کہ آج اگر اشخاص مذکورہ موجود ہوتے تو ضرور سبق اس علم میں اس ظلم کے باقی اور سے بصد شوق پڑھتے اور

اس کو استاد زمانہ وظالمانہ روش میں آ کر استاد کل مانتے ہیں۔

سبحان اللہ! اسکی کون کون سی تعریف پیش کروں ایک ہو یا دو صد یا ہزار کہ تحریر کے نیچے آتی بے شمار ہیں کیا کریں۔ اب ایک بطور مثال صحیح اور صدق سے کہہ رہا ہوں آپ شوق اور دل سے مان لیں۔ مدینہ منورہ میں جب دیکھا گیا کہ مسجد نبوی میں قرآن کریم کثرت سے پڑھا جاتا ہے تو یہ فقیر جب زیارت جنت البقیع کو جاتا تھا تو ایک دن خیال آیا کہ بہتر ہوگا کہ قرآن شریف ہمراہ لے جا کر تلاوت قرآن شریف کریں تو بہتر ہوگا۔ چونکہ قبرستان ایک عظیم الشان چیز ہے تو خیال آیا کہ حضرات اہل بیت مطہرین کی قبروں کے پاس بیٹھ کر قرآن شریف پڑھوں۔ الحمد للہ کہ ایک دن تو جنت البقیع میں داخل ہو کر حضرت جنت خاتونؓ کے مقبرہ کے قریب قبر حسن مجتبیٰ ابن علیؑ اور حضرت امام جعفر صادق اور حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام زین العابدین اور حضرت عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم جن کے گھر میں قرآن کے نازل ہونا ثابت ہے اور جن کا ہر فعل اور ہر قول قرآن ہے، جب ان حضرات کی قبور کے نزدیک قرآن پڑھا تو ایک دن تو بے فکر بلکہ بافکر ہو کر پڑھتا رہا اور بعد دعا کے واپس آ گیا آخر دوسرے دن جب قرآن شریف لے گیا اور پڑھنے لگا تو سپاہی جو کہ پہرہ پر لگا کھڑا تھا زور سے آواز دے کر کہنے لگا کہ ''اے حاجی قرآن ممنوع''، تین دفعہ جب اُس نے یہی الفاظ دہرائے تو مجبور ہو کر قرآن شریف کو ختم کر کے دروازہ جنت البقیع پر آ پہنچا مگر دل میں سخت افسوس آیا کہ سپاہی سے کچھ بول چال کرنے کو تیار ہو گیا مگر سپاہی کی اشراف طبیعت نے مزاحمت سے چھڑایا۔ فقیر نے سپاہی کو کہا کہ آیا۔

قرآن کریم عند اللہ و عند الرسول آیا عند الحکومت دو دفعہ یہ الفاظ دہرائے تو سپاہی نے جواب دیا کہ ''حکومت''، تو فقیر کی زبان بند ہوگئی چونکہ اگر وہ اللہ اور رسول کہتا تو گفتگو طوالت پکڑتی مگر یہ عاصی چپ چاپ ہو کر بادشاہ منصف مزاج اور باعدل وانصاف کی تعریف کرتے کرتے واپس آ گیا زیادہ کیا عرض کروں۔

☆☆ ☆☆ ☆☆

احباب اور معتقدین کا تعارف



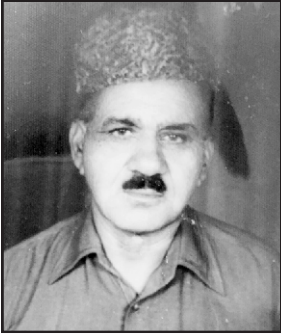
سید محمد ایوب بخاری

سید محمد ایوب بخاری سادات پیر سباک کا ایک دمکتا ستارہ ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے قانون دان ہیں۔ سپریم کورٹ میں پریکٹس کرتے ہیں اور ان کا شمار نہ صرف ضلع اٹک بلکہ پاکستان بھر کے چوٹی کے وکلاء میں ہوتا ہے۔ اپنے وقت میں سیاست میں عملی طور پر حصہ لیا اور مختلف سیاسی تحریکوں مثلاً تحریک بحالی جمہوریت، تحریک تحفظ ختم نبوت، تحریک نظام مصطفےٰ اور اس قسم کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مختلف سیاسی پارٹیوں میں بھی عملی طور پر حصہ لیا اور جمہوریت کیلئے بیش بہا قربانیاں دیں۔

بخاری صاحب کی شہرت یوں تو ایک نامور وکیل کی ہے لیکن تاریخ (خصوصاً اسلامی تاریخ) اسلامی فقہ، شرعی قوانین، اردو اور انگریزی ادب کی علمیت میں آپ ایک بلند مقام پر فائز ہیں۔

سادات اور خصوصاً سادات پیر سباک کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ آپ نے ہی پہلی مرتبہ حضرت پیر سباک کے پوتے اور نامور درویش بزرگ حضرت پیر سید زین الدین (بانی بیت الغریب شریف) نوشہرہ کی مشہور قلمی کتاب بضعۃ الاربعین کو مدون کر کے اسے اصلی حالت میں طبع کروایا اور بعد ازاں اسی کتاب کا نہایت جانفشانی سے اردو ترجمہ کر کے ''بضعہ واربعین'' کے نام سے شائع کیا جس سے اسلامی ادب اور احادیث کے علوم میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

سید محمد ایوب بخاری کے چھوٹے بھائی سید زاہد حسین بخاری بھی ایک نامور قانون دان اور مذہبی و سماجی رہنما کے طور پر جانے جاتے ہیں۔



کپتان سید حلیم شاہ

کپتان سید حلیم شاہ ہمارے جدِ امجد پیر سباکؒ کے پڑپوتے گنج علوم پیر سید محمد علی شاہ اول کی اولاد سے ہیں۔ گزشتہ اوراق میں ذکر ہو چکا ہے کہ آپ پیر سید محمد علی شاہ اول کے بیٹے سید مہر محمد شاہ کی اولاد سے ہیں آپ کے بزرگوں میں سید مظفر شاہ ولی کامل اور عالم بے بدل گزرے ہیں۔ جنہوں نے خود کئی تصنیف کی ہیں اور مختلف علوم پر مبنی کتابوں کی ایک ضخیم لائبریری آپ کے زیر تصرف تھی۔ کپتان سید حلیم شاہ خانوادۂ تبی سر ضلع میانوالی کے سید علی اکبر شاہ کے فرزند ہیں۔ سید علی اکبر شاہ کے تین نامور بھائی بھی گزرے ہیں جن کے نام سید گلاب شاہ، سید رضا شاہ اور سید مخدوم شاہ ہیں اور تینوں بھائیوں کو اللہ تعالیٰ نے اولاد کثیر سے نوازا۔

سید حلیم شاہ کو ہم کپتان ماماجی کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ انہوں نے جنگ عظیم دوم میں برطانوی افواج میں کیپٹن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد فوج کی خدمات سے سبکدوش ہو کر گھر آ گئے اور موضع تاجہ زئی ضلع لکی مروت (اُس وقت ضلع بنوں) میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گئے۔ چونکہ وہ رشتے میں ہماری والدہ کے خالہ زاد بھائی تھے اس لیے ہمارے ماموں لگتے تھے۔

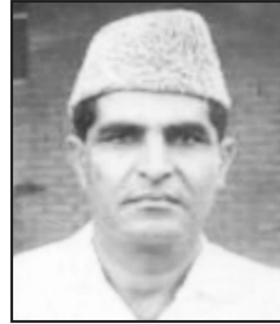
کپتان صاحب مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے نیک اور نامور اولاد سے نوازا۔ بڑے بیٹے سید الطاف حُسین شاہ سی۔ ایس۔ ایس کر کے محکمہ ڈاکخانہ جات میں شامل ہوئے اور ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اُن سے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر سید چراغ حُسین شاہ میڈیکل شعبہ میں گئے اور محکمہ صحت میں ڈی۔ ایچ۔ او اور ایم۔ ایس کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ تاہم اُن کی وجہ شہرت علمی و ادبی ہے۔

تاریخ، فلسفہ، تصوف، پشتو ادب و تاریخ اور سیاحت پر وہ مستند عالم مانے جاتے ہیں۔ متعدد اُردو اور پشتو کتابوں کے مصنف ہیں۔ تذکرہ پیر سباکؒ ان کی قابل قدر تصنیف ہے۔ پشاور میں مستقل قیام پذیر ہیں اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ تیسرے اور سب سے چھوٹے بیٹے سید

اختر حسین شاہ گومل یونیورسٹی ڈی۔آئی خان میں طویل خدمات سرانجام دینے کے بعد ڈائریکٹر پرچیز اینڈ سٹور کے عہدے سے سبکدوش ہوئے ہیں۔

سید حلیم شاہ مرحوم کی زندگی انتہائی پارسائی، رزق حلال کے حصول ڈسپلن اور اصول پسندی پر مبنی تھی انہوں نے اپنے خاندان کے کئی بچوں کی تعلیم میں معاونت کر کے انہیں کامیاب زندگی تک پہنچایا۔ پیر صاحب جب کبھی بنوں کے دورے پر جاتے تو آپ کے ہاں ضرور قیام کرتے دونوں میں پیار و محبت کا رشتہ آخری دم تک قائم رہا۔ آپ نے 1980ء میں اس دار فانی کو الوداع کہا اور موضع تاجہ زئی میں اپنے مدفن میں محوِ استراحت ہیں۔

میر باز خان مرحوم:



میر باز خان پشتونوں کے ایک باوقار اور نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے اور معزز قبیلے مروت کی ایک شاخ خواجہ خیل خاندان سے تھے۔ خان موصوف اپنے لڑکپن بلکہ بچپن سے ہی پیر صاحب کی ذات سے وابستہ رہے اور ان کی وفات تک اُنکے حلقہ ارادت میں رہے۔ میر باز خان کے والد، والدہ ان کے برادران حاجی فیروز خان، حاجی ممریز خان، حاجی نوروز خان اور حاجی گل باز خان اور ان کا تمام خاندان پیر صاحب کا عقیدت مند تھا۔ لیکن جو عقیدت اور محبت حاجی نوروز خان اور میر باز خان کے دل میں پیر صاحب مرحوم کے لیے تھی اُس کی مثال نہیں ملتی۔

راقم الحروف تو اس تعلق کا عینی گواہ اُس وقت سے ہے جب وہ پشاور میں محکمہ سریکلچر کے ڈائریکٹر ہونے کی حیثیت سے نشتر آباد میں مقیم تھے۔ پیر صاحب مہینہ دو بعد پشاور کا چکر لگاتے اور یہاں پر میرے اور بڑے بھائی کے رہائش پذیر ہونے کے باوجود میر باز خان کے گھر واقعہ نشتر آباد میں اُن کے ساتھ ہی ٹھہرتے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کے پشاور آنے کا وقفہ طویل ہوا تو وہ پشاور میں رہائش پذیر ہم

بھائیوں سے التجائیہ انداز میں کہتے کہ گاؤں جاؤ اور پیر صاحب کو کسی بہانے پشاور لے آؤ اور اگر کبھی واقعی ان کے آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ اپنی جیپ لے کر اُن کے پاس گاؤں روانہ ہو جاتے اور انہیں پشاور لے آتے۔ پشاور میں میر باز خان کی رہائش گاہ میں ایک چھوٹا سا کمرہ ''پیر صاحب کوٹہ'' یعنی پیر صاحب کے کمرے کے نام سے وقف تھا۔ اُن کے اہل خانہ حتیٰ کہ ان کے گھریلو ملازم مراد چترالی کو بھی پتہ ہوتا تھا کہ ان کی عمومی اور پسندیدہ خوراک چپاتی اور ساگ ہے یا کبھی کوئی دوسری سادہ سی خوراک۔

پیر صاحب سے عقیدت ہونے کے باوجود وہ پیر صاحب سے بے تکلفی سے بھی گفتگو کر لیا کرتے تھے۔ اپنے ہر مسئلے اور مشکل کا ذکر پیر صاحب سے کرتے اور ان سے مشورہ لیتے۔ اکثر گلہ مند رہتے کہ پیر صاحب اپنی اولاد اور خاندان کے لیے تو دعائیں کرتے ہیں مگر میرے لیے دعا نہیں کرتے۔ پشاور میں قیام کے دوران انہیں اپنے ساتھ گاڑی میں مختلف روحانی اور اہم شخصیات سے ملاقات کے لیے لے جاتے۔

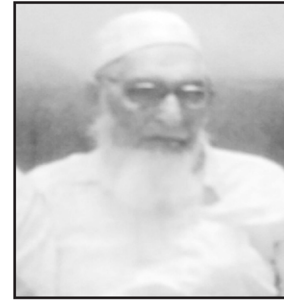
مرحوم کی بے تکلفی اور خوش مزاجی کا ذکر ہوا تو یاد آیا کہ وہ پیر صاحب کی درویشانہ، بے غرض، سخاوت اور توکل کی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اکثر ان کی عدم موجودگی میں کہتے کہ یہ تو پیر صاحب نہیں بلکہ ''پیر خان'' ہیں۔ ان کی مرض الموت میں تقریباً ہر روز ہسپتال آتے اور ہم سے ان کی علاج اور خیریت کے بارے میں دریافت کرتے اور ہسپتال کے بڑے ڈاکٹروں سے مل کر اُن سے بھی پیر صاحب کے علاج کے بارے میں دریافت کرتے۔ میر باز خان خود ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے سیاسی اور قومی معاملات کی سوجھ بوجھ میں کمال حاصل تھا۔ ملازمت سے پہلے طالب علمی کے زمانے میں تحریک پاکستان سے تعلق رہا اور ملازمت کے بعد بھی مسلم لیگ میں پاکستان کے چوٹی کے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے۔ اگر کتاب کی ضخامت اجازت دیتی تو پوری ایک کتاب اُن کی شخصیت پر لکھی جا سکتی ہے۔

قبلہ والد صاحب کی نصف شب کے قریب جب روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تو سب سے پہلی شخصیت جن کو ٹیلی فون پر میں نے اطلاع دی وہ مرحوم میر باز خان تھے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے ان کو ہسپتال سے فون پر اطلاع دی تو وہ تھوڑی دیر کے لیے سکتے میں آ گئے پھر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا

تو اُنکی آواز بھرا گئی اور مزید گفتگو کا یارا مجھ میں بھی نہیں تھا سو ٹیلی فون بند کر دیا۔ مرحوم 19 سال تک یوسف بے کارواں رہ کر اگست 2009ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حاجی نوروز خان مرحوم:



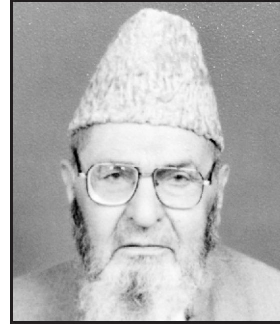
حاجی نوروز خان مرحوم کا تعلق بھی مروت قبیلے کے خانوادہ خواجہ خیل سے تھا وہ حاجی شیر داد خان آف خواجہ خیل کے دوسرے بیٹے تھے۔ پیر صاحب سے تعلق اور ارادت انہیں اپنے والدین سے ورثے میں ملی۔ لہٰذا وہ بھی اپنے دیگر بھائیوں کی طرح بچپن سے ہی پیر صاحب کے عقیدت مند تھے۔ حاجی نوروز خان کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے پیر کے عاشق تھے۔ ہم نے تو بچپن سے انہیں دیکھا کہ وہ لکی مروت سے ٹرین سے سفر کر کے فتح جنگ اور پیر صاحب کے گاؤں گکھڑ کے سات آٹھ کلومیٹر کے پہاڑی راستے کو پیدل طے کر کے ہر پانچ چھ ماہ بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ پیشے کے لحاظ سے ٹھیکیدار (گورنمنٹ کنٹریکٹر) تھے۔ پہلی مرتبہ جب جیپ خریدی تو اُسی جیپ پر پیر صاحب سے ملنے آئے۔

ایک واقعہ۔۔۔:

میں نویں کا طالب علم تھا کہ والدم صاحب کے ہمراہ اپنی اکلوتی پھوپھی مرحومہ کے گھر واقع تبی سر (نزد شکر درہ) ضلع میانوالی گئے وہاں سے واپس آ کر اگلی منزل لکی اور خواجہ خیل تھی۔ حاجی نوروز خان کو کسی طرح پیر صاحب کے تبی سر جانے اور واپس خواجہ خیل جانے کی اطلاع ہوگئی۔ اس زمانے میں نہ ٹیلی فون تھے اور نہ موبائل۔ اپنے اندازے سے آئے کہ پیر صاحب کو راستے میں Receive کر سکوں۔ چنانچہ وہ ماڑی انڈس کے سٹیشن پر ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ ماڑی انڈس اور کالا باغ کے درمیان انگریزوں کے دور کا ایک پل ہے جو ڈھانچے کی شکل میں آج بھی کھڑا ہے اور قابل استعمال

ہے اور اُس پر سے گاڑیاں گزر سکتی ہیں۔ جبکہ اُس زمانے میں ماڑی انڈس سے جانے والی ٹرین کالا باغ سے ہو کر لکی اور بنوں وغیرہ جاتی تھی۔ مگر آج کل ٹرین بند ہو چکی ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ والدم صاحب (پیر صاحب مرحوم) کالا باغ میں دریائے سندھ کے بالکل کنارے پر تعمیر شدہ ایک مسجد میں بیٹھ گئے۔ اور راقم الحروف اور میرے پھوپھی زاد بھائی سید نقاب شاہ مرحوم ان سے اجازت لے کر سیر کے مقصد سے کالا باغ کا ریلوے پل پیدل عبور کر کے ماڑی انڈس پہنچ گئے۔ مقصد صرف سیر و سیاحت تھا۔ ہم ماڑی انڈس کے سٹیشن پر ریل گاڑیاں دیکھ رہے تھے کہ پٹڑی عبور کرتے ہوئے مجھے حاجی نوروز خان نظر آ گئے اور میں نے انہیں پہچان کر آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ میں نے انہیں کس طرح پہچان لیا اور ساتھ ہی خوش بھی کہ جس پیر صاحب کو وہ ٹرین کے ڈبوں میں تلاش کر رہے تھے۔ ان کے صاحبزادے سے ملاقات ہوگئی۔ ہم تینوں خوشی خوشی پیدل ہی واپس کالا باغ اُسی مسجد میں آئے جہاں پیر صاحب محوِ استراحت تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ نوروز خان پیر صاحب سے ملاقات پر کس طرح اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور بار بار پیر صاحب کے سامنے میری ذہانت کی تعریف کیے چلے جا رہے تھے۔ وہ حیران تھے کہ میں نے انہیں کس طرح پہچان لیا۔ بہر حال اس سے اگلا سفر (کالا باغ سے لکی تک) ہم نے طے کیا اور چند راتیں حاجی نوروز خان کے گھر واقعہ لکی شہر میں گزاریں اور پھر خواجہ خیل روانہ ہوگئے۔ واقعہ بیان کرنے کا مقصد پیر صاحب سے حاجی نوروز خان کی محبت اور عقیدت کو ریکارڈ پر لانا ہے۔ بعد ازاں جب سڑکیں وغیرہ بن گئیں تو پھر اپنی اہلیہ کے ہمراہ بھی اُسی تواتر سے اپنے پیر صاحب کی زیارت کے لیے آتے تھے اور کئی روز ہمارے ہاں ٹھہر کر سکون قلب کی دولت لے کر واپس جاتے۔ کالا باغ میں ہونے والی میری زمانہ طالب علمی کی ملاقات کے بعد مجھے ان سے ایک ذاتی وابستگی پیدا ہوگئی۔ میں اُن کے بڑے بیٹے حاجی شہباز خان مرحوم کا کلاس فیلو اور دوست بھی تھا اس لحاظ سے بھی وہ میرے ساتھ بہت محبت سے پیش آتے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں تھیں کہ پنہاں ہوگئیں



حاجی ممریز خان ٹھیکیدار

حاجی ممریز خان علاقہ لکی مروت کے خانوادۂ خواجہ خیل کے شیر داد خان کے بیٹے تھے اور حاجی حکیم اللہ، حاجی فیروز خان، حاجی نوروز خان، حاجی گلباز خان اور میر باز خان کے بھائی تھے۔

حاجی ممریز خان ایک بہت بڑے گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے۔ اپنے پیشے کے تقاضوں کے تحت وہ اپنے آبائی گاؤں خواجہ خیل سے نقل مکانی کر کے پشاور میں آباد ہو گئے تھے۔ اپنے والد اور خاندان کے دیگر افراد کی طرح وہ بھی پیر صاحب مرحوم کے عقیدت مندوں اور جانثاروں میں شامل تھے۔ پیر صاحب پشاور آتے تو اگر چہ ان کا ٹھکانہ اُن کے بھائی میر باز خان کا گھر ہوتا مگر حاجی ممریز خان پیر صاحب سے بغرض دعا ملاقات کے لیے ضرور حاضر ہوتے۔

حاجی ممریز خان اپنے وقت کے لحاظ سے شہر کے ایک متمول ٹھیکیدار تھے، ان کی پہچان ایک مخیر" شخصیت کی تھی مگر اس کے ساتھ وہ ایک دردمند اور درویشانہ دل و دماغ کے مالک بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شہر میں اُن کے مراسم ادیبوں، شاعروں اور اللہ والوں سے بھی تھے۔ مشہور مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی جب ملازمت کے سلسلے میں پشاور میں مقیم تھے تو حاجی ممریز خان کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات تھے جن کا ذکر انہوں نے اپنی مزاحیہ تصنیفات میں کئی بار کیا ہے۔ اسی طرح ایک مردِ قلندر لالہ عبدالرحیم نیازی جو پشاور یونیورسٹی کے ابتدائی اساتذہ میں سے تھے سے بھی آپ کے عقیدت مندانہ مراسم تھے۔

حاجی ممریز خان کے یہی مراسم پیر صاحب کے اور لالہ عبدالرحیم نیازی کے درمیان ایک وجدان بھری ملاقات کا سبب بھی بنے (اس ملاقات کا ذکر اسی کتاب میں مشہور دانشور ڈاکٹر چراغ حسین شاہ نے اپنے مضمون ''بابا جی پیر سید محمد علی شاہ'' میں تفصیل سے کیا ہے)۔

حاجی ممریز خان ایک زندہ دل اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ آپ 20 دسمبر 2015ء کو اپنی بیٹوں محمد منیر خان، محمد نذیر خان اور محمد بشیر خان اور دو بیٹیوں کو سوگوار چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوئے۔



حافظ غلام قادر:

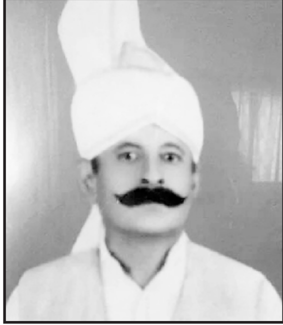
حافظ صاحب مرحوم ہمارے والد صاحب کے آبائی گاؤں لنگر کے باشندے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ محترم حافظ صاحب اور قبلہ والد بزرگوار کے تعلقاتِ دوستانہ اور برادرانہ کا آغاز کب ہوا مگر یہ جانتا ہوں اور بچپن سے یہی مشاہدے میں آیا کہ ہمارے والد محترم پیر صاحب کے سب سے عزیز دوست لنگر والے حافظ غلام قادر ہیں۔ چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ سجائے، نظر کے چشمے پہنے، ہلکی ہلکی فرنچ کٹ داڑھی والے، بچوں، نوجوانوں اور بڑوں میں یکساں مقبول، ایک نفیس اور خوش لباس شخصیت کو جب بھی آپ دیکھیں تو وہ حافظ غلام قادر ہوں گے۔ اپنے والد بزرگوار کی طرح ہم بھی انہیں حافظ جی صاحب ہی کہتے۔ ان کی کوئی سنجیدہ اور پند و نصائح والی گفتگو تو یاد نہیں لیکن جب بھی ان سے ملاقات ہوئی کوئی لطیفہ یا کوئی ایسی خوشگوار بات ضرور کرتے جس سے ہم کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔

مجھے یاد ہے کہ حافظ جی جب کبھی پیر صاحب سے ملنے ہمارے گاؤں آتے تو ہماری والدہ مرحومہ بھی خصوصی اہتمام سے چائے تیار کرتیں۔ بسکٹ وغیرہ کا تو اُس وقت رواج نہیں تھا لیکن چائے کے ساتھ اُبلے ہوئے دو انڈے اور نمک اور پسی ہوئی کالی مرچ والی ایک دو خانوں والی ایک خاص نمک دانی ساتھ رکھتیں۔ حافظ جی صاحب چائے کو دیکھتے ہی فرماتے کہ کنجوس چینک (چائے دانی) پھر آ گئی اور ہم اپنے والد محترم کے سامنے کچھ جھینپ سے جاتے اور شرما کر ہنس دیتے۔ دراصل یہ چائے دانی جو کافی قیمتی اور نفیس چینی سے بنی ہوئی ایک خوبصورت برتن کے طور پر (چینک) ہمارے گھر میں بڑے کمرے کی کارنس پر سجی رہتی اور صرف خاص مہمانوں کی تواضع کے لیے اُتاری جاتی۔ لیکن اس میں خاص بات یہ تھی کہ اس کی نوزل کا سوراخ قدرے تنگ تھا اور چائے کی کم مقدار اس سے نکلتی تو حافظ جی صاحب اس چینک کو دیکھ کر ہنس دیتے اور اس کا نام کنجوس چینک رکھ دیا۔ اور یہ لطیفہ ہر بار واقع ہوتا۔ پیر صاحب تقریباً ہر روز یا دوسرے تیسرے دن لنگر گاؤں کا چکر لگاتے تو اُن کی بیٹھک اور مجلس لنگر میں صرف حافظ جی صاحب کے پاس ہی ہوتی۔ بلاشبہ لنگر میں اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی زیادہ عزیز اگر کوئی تھا تو وہ حافظ غلام قادر ہی تھے۔

حافظ صاحب صرف اپنے گاؤں کے ہی نہیں بلکہ پورے علاقے کے ایک پڑھے لکھے، دانشور اور علم دوست انسان سمجھے جاتے تھے۔ اور پیر صاحب محترم کے ساتھ ان کی دوستی کا سبب بھی ان کی یہی خصوصیت یعنی علم دوستی ہی تھے۔ حافظ قرآن ہونے کے ساتھ دینی علوم میں بھی انہیں دسترس حاصل تھی۔ علم وادب سے گہرا شغف تھا۔ مجھے یاد ہے میری کم عمری کے زمانے میں والد بزرگوار اور مرحوم کے ہاتھ میں ایک کتاب بنام ''الہامات غالب'' دیکھتا جس کے پہلے صفحات پر جلی حروف میں (غالباً حافظ صاحب کے قلم سے) ''حافظ غلام قادر آف لنگر'' لکھا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں شخصیات کے درمیان علمی گفتگو کے علاوہ اعلیٰ پائے کے علم وادب کے شاہپاروں کا بھی باہمی تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ جس طرح ہماری کوتاہی سے 30,25 سال کی ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد پیر سید محمد علی شاہ کے علمی وروحانی مرتبے کے بارے میں معلومات کے ایک گراں قدر ذخیرے سے ہم محروم ہو چکے ہیں اور آج اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے مصداق ہم اُن کے بارے میں اس مجموعے میں بہت کم معلومات دے سکے ہیں اسی طرح حافظ صاحب کی شخصیت اور علمی مرتبے کے بارے میں کچھ بیان کر سکنے کے بارے میں بھی معذور ہیں۔ ہاں ان کی میراث میں اُن کی اولاد اور خصوصاً ان کی دخترِ نیک اختر ڈاکٹر فہمیدہ کی شخصیت ایک ایسی مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے جو حافظ صاحب کی علمی اور انسانی حیثیت کا ایک واضح عکس ہیں۔

مندرجہ تحریر حافظ صاحب کی شخصیت اور مرتبے کے مقابلے میں ایک عشر عشیر بھی نہیں ہے اور خود ڈاکٹر فہمیدہ جیسی علمی مرتبے والی خاتون کے سامنے ان کے والد بزرگوار کو یہ خراج تحسین سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف اور میرے جیسے کم علم اور کم فہم انسان کے لیے باعث شرمساری بھی ہے۔ تاہم اپنی بے بسی اور کم علمی کا اظہار کسی شاعر کے وسیلے سے اس طرح کروں گا کہ

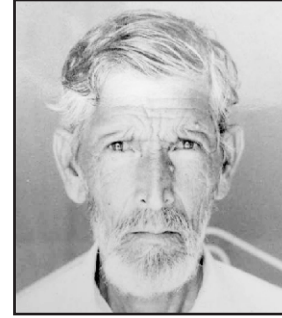
جو بھی کہتا ہے دل، وہ لکھتے ہیں
ہم سے فنکاریاں نہیں ہوتیں



سردار سلطان محمود خان آف دھریک:

سردار صاحب کا خاندان علاقہ نلہ (اٹک اور راولپنڈی) کا مشہور کھٹڑ خانوادہ ہے جن میں سردار سکندر حیات خان سابق وزیر اعظم متحدہ پنجاب، سردار ممتاز علی خان سابق مرکزی وزیر، سردار شوکت حیات خان (مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کے دست راست) جیسی چند مشہور ہستیاں گزری ہیں جن کے خاندان واہ، باہتر، دھریک، جھنگ اور ضلع اٹک اور پنڈی کے مختلف مواضعات میں رہتے ہیں۔ سردار سلطان محمود موضع دھریک کے رہائشی تھے اور موضع لنگر، باہتر، دھریک اور مقام کے مواضعات میں اپنی جاگیر کی نگرانی کرتے تھے۔ مرحوم طبیعت کے لحاظ سے ایک جابر اور سخت گیر خان مشہور تھے۔ اپنی وضع قطع، لباس اور طرز بود و باش سے بھی پی۔ ٹی۔ وی کے مشہور ڈرامے وارث کے کردار ''چوہدری حشمت'' سے مشابہہ تھے۔ مگر اس کے برعکس ان کے اندر کچھ ایسی صفات بھی مشہور تھیں جو ان کی ساری کمزوریوں پر حاوی ہیں۔ مثلاً وہ اپنی ماں کے انتہائی فرمانبردار اور تابع فرمان کے طور پر مشہور تھے۔ نرینہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے دوسری شادی کی تو والدہ کی زندگی تک انہیں اس کی بھنک بھی پڑنے نہ دی۔ مبادا وہ یہ خبر سن کر ناراض ہو جائیں۔ بچپن میں میں نے انہیں گھوڑے پر سوار ہو کر اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھا مگر بعد ازاں وہ ایک جیپ میں سفر کیا کرتے تھے۔ ہمارے دادا جان کا گاؤں لنگر باہتر اور ان کی جائے رہائش مقام کے درمیان واقعہ تھا اور قریب بھی تھا موضع لنگر میں بھی ان کی کافی جائیداد تھی جس کی نگرانی ان کے کارندے کرتے تھے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ والدم صاحب کے ساتھ ان کے تعلقات کب سے استوار ہوئے تاہم وہ وقتاً فوقتاً ان کے پاس حاضری دینے کے لیے آتے رہتے اور اس حوالے سے وہ مشہور واقعہ زبان زد عام ہوا اور جس کا ذکر کتاب کے مختلف مضامین میں موجود ہے۔ جس میں آپ کے پیر صاحب مرحوم کے گھر حاضر ہونے کا ذکر ہے اور جس میں ان کی عدم موجودگی میں جو پیغام چھوڑا تھا کہ پیر صاحب اگر واپس آئیں تو اُن کو کہنا کہ تمھارا ''خادم'' حاضر ہوا تھا۔ (لفظ

خادم میں نے قصداً بدل کر لکھا ہے کہ میں اُن کی زبان سے ادا کیے ہوئے الفاظ کو دہرانے کی جراءت نہیں کر سکتا کہ وہ جو کچھ بھی کہیں میرے بزرگوں کے محبّ تھے اور اس لحاظ سے میرے بزرگ تھے)۔ اپنے بڑوں سے ہی میں نے اکثر سُنا کہ پیر صاحب مرحوم اکثر اوقات اُن کی سخت گیر طبیعت اور زیادتی کرنے پر سرزنش بھی کر دیا کرتے تھے اور وہ سر جھکا کر خاموشی سے اس کو سن لیتے ۔



لالہ مہدی:

لالہ مہدی ہمارے گاؤں کا ایک ایسا فرد تھا جو باوجود غریب اور نادار ہونے کے چند اعلیٰ خوبیوں اور صفات کا حامل تھا۔ پیر صاحب مرحوم سے اس کی عقیدت عشق کی حد تک تھی۔ گاؤں کے ''خوانین کا ہمسایہ'' اور ایک مزدور کار ہنر مند ہونے کے باوجود اس کے دن رات پیر صاحب کی خدمت اور اطاعت میں گزرتے۔ نماز پنجگانہ کی ادائیگی اور ہر نماز کے لیے اذان کی ادائیگی اس کا شعار اور شب و روز کا معمول تھا۔ انتہائی خوش الحان تھے اور ان کی اذان کی آواز سن کر ایک سحر سا طاری ہو جاتا۔ جس دن کسی وجہ سے وہ اذان نہ دے سکتے تو ایک عجیب سا تجسس ہوتا کہ کیا وجہ ہوگئی کہ آج لالہ مہدی اذان کے لیے نہیں آئے۔ اگر اس بات کو گستاخی اور بے ادبی پر محمول نہ کیا جائے کہ یہ حوالہ ایک بہت عظیم شخصیت سے منسوب ہے کہ لالہ مہدی کی اذان میں ''بلالی لحن'' اور پیر صاحب سے عشق کی حد تک عقیدت سمجھ نہیں آتی کہ یہ تشبیہ غلط ہے یا صحیح لیکن میں نے ساری عمر اسی بات کا مشاہدہ کیا اور اسی لیے اس کی مثال دی۔ لالہ مہدی کی پیر صاحب سے عقیدت اور محبت اُن کی ذات سے آگے بڑھ کر ان کی اولاد یعنی ہم جیسے دنیاداروں تک پہنچی ہوئی تھی اور اگر چہ ہم خود اس میں شرمندگی محسوس کرتے تھے۔ مگر لالہ مہدی جب بھی ہم سب چھوٹے بڑے بھائیوں سے ملتے اور مصافحہ کرنے لگتے تو ادب سے جھک کر ہمارے گھٹنوں کو چُھو لیتے۔ پیر صاحب کی وفات کے بعد وہ بہت مغموم رہتے۔ ہم جب گاؤں جاتے تو وہ پیر صاحب کا ذکر چھیڑ کر کچھ یادیں تازہ کر لیتے۔ نہ جانے کیوں مجھے اقبالؒ کا یہ شعر بار بار یاد

آتا ہے جس میں پیغمبر اعظم ﷺ کے سچے عاشق اور مؤذن حضرت بلالؓ کا ذکر ہے۔

اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز اس نظارے کا اِک بہانہ بنی

اقبالؒ



حاجی سیدن گل شاہ مرحوم:

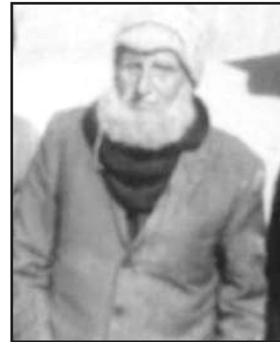
رشتے میں ہمارے والد مرحوم کے فرسٹ کزن تھے اور سمدھی بھی، واجبی سی تعلیم تھی۔ گزر اوقات کھیتی باڑی اور زمینداری تھا۔ ایک آبائی قطعہ زمین کو (جس کو ہم باغ کہتے تھے) اس طرح آباد کیا کہ واقعی ایک باغ کا سماں ہوتا تھا۔ شہتوت، انگور اور انجیر کے بے ترتیب درخت باغ میں کثرت سے موجود تھے۔ مگر ان کے پھل یا تو جنگلی پرندے کھاتے یا باہر سے آنے جانے والے برسرِ عام یا چھپ کر مستفید ہوتے۔ ان سے کوئی تجارتی فائدہ نہیں اُٹھاتے تھے۔ رشتے میں ہمارے نانا بھی لگتے تھے۔ کیونکہ ہماری نانی کے چچازاد بھائی تھے اور اس حوالے سے ہماری والدہ سے انتہائی محبت کرتے تھے۔ سرخ وسپید چہرہ اور سفید داڑھی کی طرح سفید اور بے داغ دل و دماغ کے مالک تھے۔ اپنے پیشے سے لگاؤ، اولاد کی پرورش و تربیت اور اپنے رب کی تابعداری (نماز پنجگانہ) ان کا معمول تھا۔ پیر صاحب کی وفات کے وقت وہ بھی بستر علالت پر تھے اور پیر صاحب کی وفات کی اطلاع ملنے پر ان سے ہی یہ مشہور جملہ ادا ہوا کہ ''آج پیر سباکیوں (سادات پیر سباک) کا چاند ڈوب گیا''۔ پیر صاحب کو کاکا کہہ کر پکارتے اور ان کی وفات کے بعد اکثر ان کا ذکر کر کے آبدیدہ ہو جاتے۔ جنوری 1987ء میں پیر صاحب کی وفات کے ایک سال بعد وہ بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

سید علی اکبر شاہ مرحوم:



رشتے میں والد بزگوار (پیر صاحب مرحوم) کے خالہ زاد بھائی تھے۔ دنیاوی تعلیم تو شاید بہت ہی واجبی سی تھی تاہم اگلے وقت کے بزرگوں کی طرح ایک مدبر اور طرح دار شخصیت کے مالک تھے۔ گاؤں کی سیاست اور دنیاداری میں اُن کی ایک پہچان اور آواز تھی۔ جلالی قسم کے پیر تھے اور جس بات کو ایک مرتبہ حق سمجھتے اس پر اڑ جاتے تھے اور پھر دنیا کی کوئی طاقت ان کو اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹا سکتی تھی۔ خود بھی کھیتی باڑی کرتے اور سیاسی معاملات اور مالک مزارع تنازعات میں مزارعین کے ساتھ ایک پہاڑ کی طرح ڈٹ جاتے اور اپنی اس فطرت پر آخری دم تک قائم رہے۔ ہماری بڑی والدہ محترمہ ان کی سگی ہمشیرہ تھیں۔ پیر صاحب سے عمر میں کم ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ان کا احترام کرتے اور لالہ جی (پیر صاحب) کا مشورہ ہمیشہ سر آنکھوں پر رکھتے اور اس پر عمل کرتے۔ اور پیار و محبت کا یہی رشتہ (ماموں بھانجوں کا رشتہ) ہمارے اور ان کے درمیان آخر دم تک قائم رہا۔ آپ بھی 9 ستمبر 1991ء کو اس دنیا سے کُوچ کر گئے اور اپنے لواحقین میں دو بیٹے سید عبداللہ شاہ اور سید گلاب شاہ اور ایک بیٹی بلقیس بیگم چھوڑ کر گئے۔

الحاج قبلہ سید زمان شاہ:



اپنی خاندانی روایت کے مطابق موضع لنگر (اٹک) سے (نقل مقانی) کر کے موضع تاجہ زئی (ضلع لکی مروت) میں آباد ہو گئے۔ کیونکہ ان کے پچازاد اور سسر موضع خواجہ خیل ضلع لکی مروت میں سکونت پر تھے۔ خود افواج برطانیہ میں بھرتی ہو کر پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا اور برطانوی فوج کے رسالہ میں دفعدار کے عہدے سے سبکدوش ہوئے جو اس وقت دیسی لوگوں کے لیے ایک باوقار عہدہ سمجھا جاتا

تھا۔ تاجہ زئی میں رہائش پزیر ہو کر جہاں انہوں نے مقامی مروت قبائل میں عزت وتکریم کا مقام حاصل کیا۔ وہیں پر ان کے بیٹوں اور بیٹیوں پوتوں، پوتیوں، نواسوں، نواسیوں نے خوب نشوونما پائی اور روحانی تعظیم کے حصول کے علاوہ دنیاوی ترقی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔

گاؤں کے لوگ انہیں ''ستر شاہ جی' یعنی بڑے شاہ صاحب کے نام سے پکارتے اور پورا گاؤں بلکہ پورا علاقہ نہایت عزت وتکریم سے پیش آتا۔ اپنے خاندان کے چھوٹے انہیں داجی کے نام سے پکارتے۔ اپنے دیگر ہم عصر بزرگوں کی طرح ان کے بھی بے شمار عقیدت مند ان پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتے۔ جسمانی مردانہ وجاہت میں بھی بے مثال تھے۔ طویل القامت، خوبصورت بھرا پُرا جسم اور سر پر لنگی یا شملہ اور سردیوں میں اوورکوٹ پہن کر وہ مردانہ وجاہت کا ایک تراشیدہ پیکر نظر آتے۔ طبیعت میں سادگی اور بے ساختہ پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

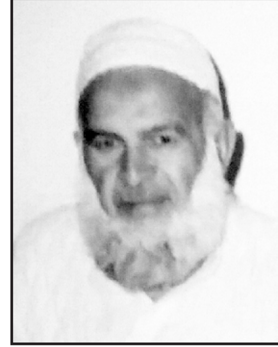
پیر صاحب جب علاقہ مروت میں اپنے عقیدتمندوں کے ہاں جاتے تو مہینوں تک خواجہ خیل اور تاجہ زئی کے انہی بزرگوں کے ہاں ٹھکانہ ہوتا اور انہی کے در دولت پر لوگ آکر پیر صاحب سے اپنے لیے دُعاؤں کے خزانے وصول کرتے۔ مرحوم ہماری والدہ کی والدہ (ہماری نانی) کے سگے چچازاد تھے۔ ہماری والدہ سے اتنی محبت تھی کہ ہم بڑے عرصے تک ان کو اپنا سگا نانا سمجھتے تھے۔

پیر صاحب کے قریبی کزن اور عمر میں ان سے بڑے تھے۔

12 دسمبر 1987ء میں وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

__☆☆____☆☆____☆☆____☆☆__

میجر سید منور شاہ:



آپ بھی پیر سباک کی محمد علی خیل شاخ کے ایک مایہ ناز بزرگ تھے۔اور پیر صاحب کے رشتے میں عمزاد لگتے تھے۔آپ کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم موضع تبی سر ضلع میانوالی میں ہوئی (موضع تبی سر صوبہ خیبر پختونخوا کے شہر شکردرہ اور صوبہ پنجاب کے شہر کالاباغ کے وسط میں ایک وسیع پہاڑی سلسلے کے اندر ایک شاہراہ پر واقع ہے)۔آپ 15 جولائی 1932 کو موضع تبی سر ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے۔میجر صاحب نے میٹرک کا امتحان موضع شکردرہ (کوہاٹ) سے 1950 میں پاس کیا۔1952 میں اسلامیہ کالج سے ایف، ایس، سی کرنے کے بعد 1955 میں پشاور یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج سے BE انجینئرنگ کی ڈگری امتیازی حیثیت سے حاصل کی اور 1956 میں پاکستان آرمی میں بحثیت کپتان EME کے محکمہ کو جائن کیا۔

1956 سے 1983 تک 27 سال تک پاکستان آرمی میں خدمات انجام دینے کے بعد آرمی سے سبکدوش ہو گئے اسی دوران آرمی کی طرف سے ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ برطانیہ بھی گئے ماؤزے تنگ کے زمانے میں چین کا بھی دورہ کیا اور پاکستان آرمی کے انجینئرنگ کے شعبہ میں دونوں ممالک کے تعلقات بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔1971ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران دو سال تک جنگی قیدی بھی رہے۔

میجر منور شاہ مرحوم پیدائشی طور پر ذہین تھے اوپر سے اُن کی محنت اور سخت کوشی نے انہیں اپنے پیشے میں ایک اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔فوج کی ملازمت اور سخت ڈسپلن میں زندگی گزارنے کے باوجود وہ انتہائی نرم مزاج، حلیم اور شفیق انسان سمجھے جاتے تھے۔ہماری دور دراز بکھری ہوئی برادری کی ہر شادی و غمی میں وہ شریک ہوتے تھے۔عام میل جول میں انتہائی ملنسار اور محبت کرنے والے شخص تھے۔خاندان کے پڑھنے لکھنے والے نوجوانوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔پیر صاحب (ہمارے والد مرحوم) سے

رشتہ دار ہونے کی وجہ سے بہت ہی محبت اور احترام کا رشتہ تھا۔اور آپس میں خط و کتابت تھی۔آپ کا 1954ء کا لکھا ہوا پیر صاحب کے نام ایک کارڈ اب بھی راقم کے پاس محفوظ ہے۔

23 دسمبر 2007ء کو آپ اپنے دو بیٹوں ڈاکٹر زبیر شاہ (سنیئر سرجن نیسکام اسلام آباد اور انجینئر طاہر شاہ سنیئر انجینئر کہوٹہ ریسرچ لیبارٹری) اور دو بیٹیوں کو چھوڑ کر اس دارِ فانی سے دارالبقاء کوچ کر گئے۔

الحاج پیر سید مقبول شاہ صاحب:

سید مقبول شاہ موضع خواجہ خیل کے معروف صوفی بزرگ پیر سید علاؤ الدین بابا جی کے بھتیجے اور سید عبدالوہاب شاہ کے فرزند تھے اور انہی کے روحانی سلسلے کے باقیات کے والی وارث اور پیشوا بنے اور یہی شخصیت بزرگوں کے روحانی فیض کو لوگوں تک تادیر پہنچانے کا ذریعہ بنے۔پیر صاحب سید محمد علی شاہ کے ہم جد اور ہم سلسلہ ہونے کی وجہ سے دونوں میں دنیاوی دوستی اور روحانی ہم آہنگی کا گہرا تعلق تھا۔پیر صاحب مہینوں ان کے ہاں رہائش پذیر رہتے۔



خلوت و جلوت کی روحانی محفلیں جمتیں، عقیدتمندوں کا جھمگٹا لگا رہتا اور ہر آنے والا اپنے ظرف اور قسمت کے مطابق فیض یاب ہو کر جاتا۔باباجی سید مقبول شاہ مرحوم کے فرزند ارجمند اور پیر طریقت الحاج سید محبوب شاہ بھی ایک پابند شریعت بزرگ اور روحانی مدراج پر فائز شخصیت تھے۔خود بھی شریعت محمدی کے عالم باعمل تھے اور اس سلسلہ کو قائم رکھنے کے لیے گاؤں کی مسجد میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا جہاں آنے والے تشنگان علم کی پیاس بجھاتے۔پیر صاحب اپنے قیام خواجہ خیل کے دوران ان دونوں بزرگوں کی میزبانی سے مستفید ہوتے۔بڑے بزرگ سید مقبول شاہ آپ کو پیر صاحب اور پیر صغیر سید محبوب شاہ آپ کو لالہ جی کے نام سے مخاطب کرتے۔کیا زمانہ تھا اور کیا مجالس سجتیں اور محبتوں کے کیسے کیسے خزانے لُٹاتے جاتے اسی قسم کے ایک مہینے دو کے لیے پیر صاحب کے قیام کے دوران میں بھی زمانہ طالب علمی (لڑکپن)

میں ان مجالس میں خاموشی سے شریک ہوتا اور بزرگوں کے طور اطوار اور عقیدت و محبت کے یادگار لمحات کو پانے کے لیے سرمایہ حیات بنا تا رہتا۔ الحاج سید مقبول شاہ نے 1983ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اُنکے فرزند ارجمند پیر طریقت سید محبوب شاہ بھی جب مئی 2011ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو یہ رُوحانی مجالس اور چشمہ فیض بھی ان کے ساتھ ہی خشک ہو گیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

سید غلام فرید شاہ مرحوم:

(سید غلام فرید شاہ مرحوم کا شمار ہمارے خاندان کے باوقار بزرگوں میں ہوتا تھا۔ جدید تعلیم میں اپنے زمانے کے معدودے چند پڑھے لکھے لوگوں میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ انگریزی زبان میں ان کی مہارت کا نقش آج بھی ان کے دونوں وکلاء بیٹوں میں موجود ہے۔ خاندانی قرابت میں وہ پیر صاحب مرحوم کے سمدھی تھے۔ ان کا تعارف ان کے نامور فرزند سید ایوب بخاری کی زبانی سُنیے
(مؤلف)

سید غلام فرید شاہ ڈھائی سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔ ہمارے دادا سید اصغر علی شاہ وسیع وعریض جائیداد کے مالک تھے۔ اور ان کے بھتیجوں نے حرص دنیا کی خاطر ہمارے والد صاحب کا عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ ہماری دادی جان سیدہ امیر بیگم نے نامساعد حالات کا مقابلہ کیا۔ بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور ان کی جائیداد کو عدالتوں کی خاک چھان کر اور سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے جو انہیں گھوڑی کی پشت پر بیٹے کو گود میں لیے بُوٹا سے پشاور تک کرنا پڑتا تھا محفوظ کیا۔ والد صاحب 1914ء میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحان میں انتہائی نمایاں حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ اور خرابی صحت کی بنا پر مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا مگر بیماری آڑے آئی اور انہیں سِلسلہ تعلیم ترک کرنا

پڑا۔ کچھ عرصہ بعد تحریک خلافت میں شامل ہوئے۔ ضلع اٹک کے تحریک خلافت کے جنرل سیکرٹری اور پابند سلاسل ہوئے چھ ماہ جیل کاٹی اور عمر بھر شریعت کی قابل رشک پابند زندگی گزاری۔ اپنے ایک گرامی قدر اُستاد مولوی محمد ابراہیمؒ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر پیری مریدی مکمل طور پر ترک کر دی انگریز کی تحصیلداری کی پیش کش پہلے ہی ٹھکرا چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے رزق کی کمی نہ تھی عادات نے کسی کا محتاج نہ کیا تھا لوگوں میں اعتماد کا ماڈل تھے علاقے کے لوگ اپنے تنازعات میں ان کے فیصلوں کو مانتے اور عدالتی کاروائیوں پر اصرار نہ کرتے۔ آپ 22 اکتوبر 1982ء کو اس دار فانی سے دارالبقاء کو کوچ کر گئے۔

ان کیلئے میری طرف سے علامہ اقبالؒ کا یہ شعر نذر ہے۔

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی، نَو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پَرتَو بھی ہے

حاجی محمد صابر:

حاجی محمد صابر کسی عالم دین، دانشور یا صاحب علم شخصیت کا نام نہیں بلکہ یہ ایک دین دار، مزدور کار اور اپنے ہاتھ سے رزق حلال کما کر اپنے بال بچوں کو کھلانے اور اُن کی پرورش کرنے والے ایک ایسے شخص کا نام ہے جس کا ذکر اس کتاب میں اس لیے کیا جا رہا ہے کہ پیر صاحب مرحوم سے اس شخص کی عقیدت بھی عشق کی حد تک تھی۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق انسانی اقدار کے حوالے سے اپنی ایک تحریر ''نام دیو مالی'' میں لکھتے ہیں کہ ''قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی اور حُسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچ ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اُونچی ذات والوں میں''۔

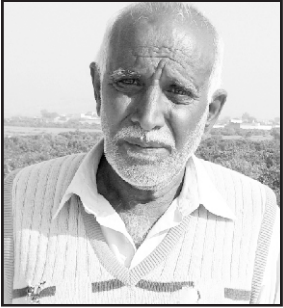
قیس ہو، کو ہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم نے انسان کی عظمت اور بڑائی کا میعار صرف طاقت، امارت، دولت، قبائلی اور خاندانی وقار یا محض علم کی کثرت کو قرار دیا ہے۔ ہم ہر اُس شخص کو بڑا آدمی کہتے اور سمجھتے ہیں جو عالیشان کوٹھی اور کار کا مالک، کامیاب سیاستدان، بڑا تاجر یا اُس کا تعلق کسی بڑے خانوادے سے ہو چاہے وہ انسانیت کے ناطے سے کتنا ہی گرا ہوا اور منافق کیوں نہ ہو مگر ایک سچا، کھرا، دیانتدار، انسانوں سے محبت کرنے والا اور رزق حلال کما کر کھانے والا انسان اُس وقت تک ہمارے معاشرے میں ایک بڑا انسان نہیں کہلا سکتا جب تک اُس کا تعلق ایک بڑے قبیلے یا خاندان سے نہ ہو۔ جب تک اُس کے پاس دولت کے انبار نہ ہوں اور جب تک وہ طاقت کے کسی نہ کسی منبع پر قابض نہ ہو۔

حاجی صابر جن کو ہم بچپن سے لالہ صابر کہتے تھے، پیشے کے لحاظ سے معمار ہیں، اپنے گاؤں میں اپنے آبائی پیشے میں مہارت حاصل کرتے کرتے وہ دوسرے شہروں میں چھوٹے موٹے ٹھیکے کرنے لگے حتیٰ کہ اسی فن کو ہاتھ میں لیے مشرقِ وسطیٰ چلے گئے۔ ''الکاسب حبیب اللہ'' کے مصداق اللہ نے انہیں اپنے گھر کے قریب بلا لیا تو وہ سعودی عرب میں جا کر عزت کی روٹی کمانے لگے۔ لالہ صابر گاؤں میں ہمارے ہمسائے تھے۔ بچپن سے ہی نماز گزار اور نیکی کی طرف مائل تھے۔ اسی لحاظ سے پیر صاحب کے ساتھ ان کا رشتہ شروع ہی سے عقیدتمندانہ رہا ہے لیکن 1980ء میں جب پیر صاحب دوسری مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے حجاز مقدس پہنچے تو برادر مکرم سید حمید شاہ (جو اُس وقت فوج کی ملازمت میں سعودی عرب میں مقیم تھے) کی اطلاع پر آپ کو لینے ائرپورٹ پر پہنچے ہوئے تھے۔ حج کے خاص ایام میں تو برادرم حج میں ہمراہی کے لیے خود پہنچے ہوئے تھے مگر باقی دنوں میں پیر صاحب کی میزبانی اور دیکھ بھال کی ذمہ داری حاجی صابر نے اپنے ذمے لے لی۔ آپ نے قیام مکہ اور مدینہ کے دوران آپ کی ایسی میزبانی کی کہ وہ ایک مثال بن گئی۔ پیر صاحب محترم اس وقت صحت مند تھے مگر عمر کے اُس حصے میں تھے

جہاں پر نوجوانوں کی راہنمائی اور مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ خود فرماتے تھے کہ دوران حج حاجی صابر نے میرا اس طرح خیال رکھا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کے لیے فکرمند ہوتی ہے۔ پیر صاحب حج سے واپس آ گئے اور کچھ عرصہ بعد حاجی صابر بھی واپس اپنے وطن آ گئے مگر دونوں حجاج کے درمیان حج کا سفر اور قیام حجاز ایک یادگار موقع بن گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد گلزار جو میرے کلاس فیلو دوست اور پاک فوج میں ملازم رہے بھی والد صاحب سے عقیدت میں کسی سے کم نہیں تھے بلکہ وہ تو بچپن سے ہی اُن کے ساتھ دلی عقیدت رکھتے تھے۔ لالہ حاجی صابر کو اللہ تعالیٰ طویل عمر نصیب کرے۔ اب وہ بھی بڑھاپے کی حد میں پہنچ چکے ہیں مگر پیر صاحب کی یاد میں ہونے والی کسی تقریب اور کسی بھی موقع پر حاضری سے پیچھے نہیں رہتے۔

حاجی ملک وارث:



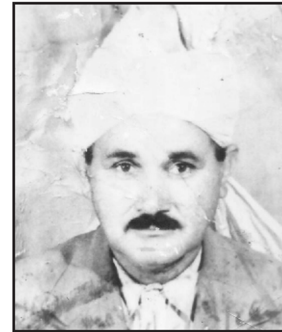
حاجی ملک وارث ہمارے گاؤں کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا آبائی پیشہ بھی زراعت ہے اور خود بھی صرف اور صرف ایک کاشتکار ہیں۔ بچپن سے ہی والد اور والدہ دونوں فوت ہو گئے اور نانی نے ان کی پرورش کی۔ لہٰذا گاؤں میں جو ابتدائی تعلیم ہوتی ہے اُس سے بھی محروم رہے۔ تاہم بڑے ہو کر کسی نہ کسی طرح فوج میں ملازم ہو گئے۔ وراثت میں کافی رقبہ زمین ہونے کے باوجود وہ اپنی جائیداد کے قبضے اور تصرف سے محروم تھے۔ لیکن فوج سے واپس آ کر انہوں نے ایک ایک کر کے اپنی زمین سنبھالنی شروع کر دی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑے زمیندار بن گئے۔ ہوا یوں کہ آبپاشی کے مقصد کے لیے انہوں نے جب اپنی زمین میں کنواں کھودنا چاہا تو گاؤں کی ایک روایت کے مطابق وہ پیر صاحب کے پاس آئے اور نشان زدہ زمین پر پہلا کدال چلانے کی درخواست کی یعنی کنویں کی کھدائی کا افتتاح کرنے کے کہا (یہ اُن کی خوش عقیدگی تھی کہ پیر صاحب جہاں کدال (کسی) ماریں گے وہاں سے پانی ضرور نکلے گا)۔ چنانچہ پیر صاحب کی دعا قبول ہوئی اور اُس وقت کے مطابق ایک بنجر زمین میں کنویں سے اتنا پانی نکل آیا کہ وہ نہ

صرف اپنی زمینوں کے لیے آج تک وافر طریقے سے استعمال کر رہے ہیں بلکہ قریب کے دوسرے زمینداروں کو بھی دیتے ہیں۔

وہ دن اور آج کا دن ان کی زمینوں کے رقبے میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور ساتھ ہی کنوؤں کی تعداد میں بھی جن کے لیے پیر صاحب نے پہلا کدال چلایا۔ آج یقین نہیں آتا کہ بچپن سے ہی ماں باپ دونوں کی شفقت سے محروم یتیم بچہ ایک دن علاقے کے سب سے بڑے "مالٹے کے باغوں" کا مالک ہوگا۔ ملک وارث کے سامنے جب کبھی بھی پیر صاحب کا ذکر ہوتا ہے تو وہ اپنی کل متاع کو اللہ کی دین اور پیر صاحب کی دعاؤں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس وسیع و عریض باغ کے داخلی دروازے پر پیر صاحب اور اُن کے ایک مرحوم صاحبزادے سید علی حیدر شاہ بخاری کی لگی تصویر اُن کی عقیدت کی ایک واضح نشانی اور مستقل روحانی رابطے کا نشان ہے۔

(حاجی ملک وارث اس کتاب کی اشاعت سے قبل 19 جنوری 2016ء کو وفات پا گئے)

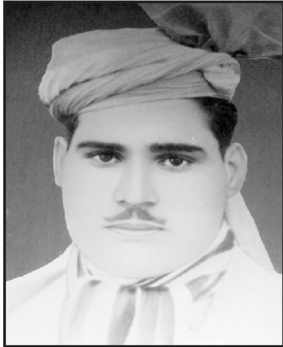
سید بہادر شاہ:



مرحوم سید بہادر شاہ پیر صاحب بزرگوارم کے خالہ زاد بھائی تھے اور ساتھ ہی ہم جد بھی، کیونکہ آپ بھی حضرت پیر سباک کے پوتے حضرت زین الدین کے فرزند، حافظ محمد عمر کی اولاد سے تھے لہٰذا نہ صرف خالہ زاد ہونے کا رشتہ تھا بلکہ پیر سباکؒ کے خاندان کے ایک نامور چشم و چراغ بھی تھے۔ وہ برطانوی فوج میں رسالدار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور اپنی اعلیٰ ذہانت، محنت، بہادری اور جرائت کی وجہ سے برطانوی حکومت سے او۔ بی۔ ای (OBE) کا خطاب حاصل کیا۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو اُس وقت بہت چیدہ چیدہ لوگوں کو حاصل ہوا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سولجرز بورڈ میں پنشنر فوجیوں کی فلاح و بہبود اور فوج میں جوانوں کی بھرتی کی خدمات مدت تک سرانجام دیتے رہے۔

راقم الحروف نے کالج کے زمانے یعنی ساٹھ کی دہائی میں انہیں اُس وقت قریب سے دیکھا

جب ہمارے والد مرحوم کیمبلپور (موجودہ اٹک شہر) آتے اور اُن سے ملاقات کے لیے ضرور جاتے۔ میری یادداشت میں وہ ایک سفید ریش باوقار اور وجیہہ بزرگ کی صورت میں موجود ہیں جو اُس وقت اٹک شہر کی ایک نامی گرامی شخصیت تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے والد صاحب کے ہمراہ جب وہ بازار یا دفاتر میں پھر رہے ہوتے تو ہر ملنے والا شخص اُن کے آگے ہاتھ پھیلا دیتا اور وہ مسکراتے ہوئے اپنے اوورکوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالتے اور اُس شخص کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ بعد میں جب میں نے پیر صاحب مرحوم (اپنے والد بزرگوار) سے پوچھا کہ وہ کیا تقسیم کرتے ہیں تو آپ نے بتایا کہ وہ اپنی جیب میں کافی مقدار میں خشک میوہ جات رکھتے تھے اور ہر فرمائش کرنے والے کو وہ مٹھی بھر میوہ عنایت کرتے ہیں۔ سبحان اللہ____ انسانوں کو خوشیاں بانٹنے کے کیا کیا طریقے تھے جو یہ بزرگ اختیار کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ والد مرحوم اپنے تمام ماموں زاد اور خالہ زاد بھائیوں سے بہت محبت سے پیش آتے مگر سید بہادر شاہ مرحوم کا تذکرہ ہمیشہ دلی محبت اور پیار سے کرتے تھے۔



سید مظفر حسین شاہ بخاری:

سید مظفر حسین شاہ مرحوم بھی موضع بُوٹا کے ایک بزرگ سید ابوالقاسم شاہ بخاری کے فرزند اور سید بہادر شاہ مرحوم کے برادر اصغر تھے اور یہ بھی رشتے میں پیر صاحب مرحوم کے خالہ زاد بھائی لگتے تھے۔ بچپن میں ہم اُن کو اُن کے اصل نام کی بجائے چاچا چَن کے نام سے جانتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن کے حُسن اور وجاہت کی وجہ سے بچپن میں اُن کے والدین انہیں چن (چاند) کے نام سے پکارتے تھے جو بعد ازاں ان کا خاندانی نام بن گیا۔ چاچا چَن واقعی اسم بامسمّٰی تھے۔ چَن کا نام اُن کے ساتھ جچتا تھا کیونکہ مردانہ حُسن اور وجاہت میں اُن کا اپنے دور میں واقعی کوئی ثانی نہیں تھا۔

اُن کے اکلوتے فرزند عزیزم سید جہان شاہ بخاری کے بقول وہ اٹک (سابقہ کیمبلپور) کے ایک

نواحی گاؤں موضع بُوٹا میں دسمبر1916ء میں خاندان سادات کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے گاؤں موضع بُوٹا میں حاصل کی۔مڈل کے بعد اٹک شہر میں تعلیم جاری تھی کہ ملازمت کا شوق بیدار ہوااور پنجاب پولیس میں شامل ہوگئے۔1935ء کے زلزلے میں آپ کوئٹہ میں خدمات انجام دے رہے تھے بعدازاں اپنے چھوٹے بھائی سید سلطان شاہ کو بطوراے۔ایس۔آئی پولیس میں بھرتی کروا کر خود ملازمت سے استعفیٰ دے کر گھر آ گئے۔واپس گاؤں آ کر گاؤں کے سرکاری سکول میں بطور مدرس تعینات ہوگئے اور عرصہ تک تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔آپ کا طبعی مزاج فطری پر ایک جگہ ٹھہر کر کام کرنے والا نہیں تھا بلکہ حرکت اور سیارہ صفت طبیعت پائی تھی۔مدرسی کرتے ہوئے ملکی دفاع کا شوق بیدار ہوااور آرمی میں بھرتی ہوگئے۔

آپ ایک چاق و چوبند، خوبصورت اور مضبوط جسامت والے خوبصورت انسان تھے۔پنجاب والی بال ٹیم کے مایہ ناز کھلاڑی رہے۔آپ کو اس وقت زبردست شہرت حاصل ہوئی جب والی بال کے ایک مشہور میچ کے دوران آپ کی زبردست شارٹ سے والی بال پھٹ گیا۔آپ کبڈی کے بھی نامور کھلاڑی تھے اور گھڑسواری کے بھی شوقین تھے اور گھڑسواری کے بڑے بڑے مقابلوں میں شرکت کرتے رہے۔

جوانی میں ہی آپ علامہ عنایت اللہ خان المشرقی سے متاثر ہو کر خاکسار تحریک میں شامل ہو گئے۔بہت جلد آپ حضرت علامہ مشرقی کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہونے لگے اور وہ بھی آپ پر بھرپور اعتماد کرتے تھے۔اس لیے انہوں نے آپ کو ذاتی باڈی گارڈ ہونے کا شرف بخشا۔خاکسار تحریک سے آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ آپ نے آخری دم تک اس کا ساتھ دیا۔تحریک پر مشکل اوقات بھی آئے مگر آپ نے حقیقت میں اس کے لیے اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کر دیا۔سختیاں جھیلیں کئی مرتبہ جیل گئے مگر تحریک کی حمایت سے کبھی منہ نہ موڑا اور آخری دم تک حتیٰ کہ علامہ مشرقی کی وفات کے بعد بھی خاکسار تحریک کے ساتھ وابستہ رہے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے
مرَے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑھو برہمن کو

اپنی متحرک اور خدمتگار شخصیت ہونے کی وجہ سے1962ء میں کراچی میں بلا مقابلہ بی۔ڈی ممبر منتخب ہوئے۔ایک مختصر علالت کے بعد بروز جمعتہ المبارک 9 فروری2001ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔آپ کی وفات پر خاکسار تحریک کے ایک چاق و چوبند دستے نے بمعہ وردی اور بیلچہ اپنے راہنما کو بعد از مرگ سلامی پیش کی اور انہیں موضع بُوٹا میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔

ملک صادق:

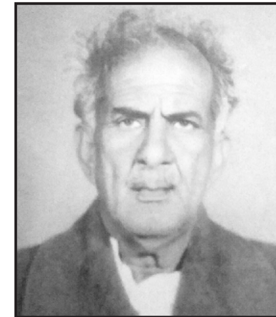


ملک صادق بھی ایک خالص زمیندار اور خود کاشتکار انسان ہیں۔یہ نہ صرف خود پیر صاحب کے عقیدت مند ہیں بلکہ ان کے والد اور دادا بھی پیر صاحب کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ملک صادق کے والد ملک شہامد بھی ایک سید سے سادھے زمیندار اور دہقان تھے۔اپنی ملکیتی زمینیں خود کاشت کرتے تھے اور ساتھ ہی بھیڑ بکریاں اور مال مویشی پالنا اُن کا سلیقہ حیات تھا۔خالص عرب بدوؤں کی طرح اکھڑ مزاج ہونے کے باوجود دین کے معاملے میں اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ملک شہامد کے بڑے بھائی بابا ملک گلاب کا نام بچپن سے ہم نے ملک کھنڈا ہی سنا تھا، انتہائی پرہیز گار، نماز گزار اور متقی انسان تھے۔رزق حلال کے لیے محنت کرتے تھے اور بس۔اپنے گھریلو اور ذاتی معالات و تنازعات سب پیر صاحب کے سامنے رکھتے تھے اور اُن کے ہر فیصلے کو بسر و چشم قبول کرتے تھے۔پیر صاحب اور ان کے خاندان سے ان کی عقیدت جو ان کے دادا بابا ملک کرم خان سے شروع ہوئی تھی آج ملک صادق اور اُن کے پوتوں تک قائم ہے۔اس عقیدت اور ارادت کو دائمی رفاقت اس طرح ملی کہ پیر صاحب مرحوم کی خوش دامن (زوجہ سید فضل حسین) نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں وصیت کی کہ میری قبر لنگر کے راستے میں بنائی جائے کہ میری بیٹی سسرال سے میکے آتے وقت میری قبر تک آسانی سے آ سکے۔اتفاق سے راستے میں ملک صادق کے دادا ملک کرم خان

کی زمینیں واقع تھیں۔ انہوں نے جب ہماری نانی مرحومہ کی وصیت اور فرمائش کا سنا تو فوری طور پر اپنی رضامندی ظاہر کر کے ان کو پیغام بھجوایا کہ وہ جہاں چاہیں قبرستان کے لیے زمین لے لیں۔ چنانچہ ہماری نانی مرحومہ (پیر صاحب مرحوم کی خوش دامن) کی بعد از وفات قبر دریائے ''نندنا'' کے کنارے پر ایک پر فضا مقام پر ملک صادق کے دادا کی بلا معاوضہ عطیہ کردہ زمینوں پر بنائی گئی اور اس کے بعد سے لے کر آج تک یہ جگہ ہمارے ذاتی قبرستان میں تبدیل ہو چکی ہے۔ چنانچہ پیر صاحب مرحوم بھی اسی جگہ مدفون ہوئے اور ان کے ساتھ ہی ہماری والدہ بی بی مدینہ خانم مرحومہ، ہماری خالہ بی بی سکینہ جان، ہمارے بھائی سید علی حیدر شاہ بخاری مرحوم، ہماری بچپن میں فوت ہونے والی بہن ممتاز بی بی اور ہمارے چند معصوم بھتیجوں کی قبریں اسی جگہ واقع ہیں۔

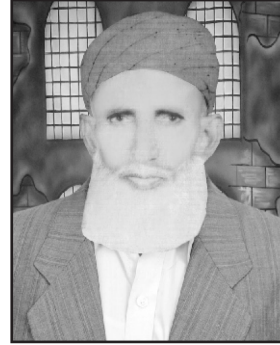
ملک صادق اور اُن کا سارا خاندان اپنی زمینوں، جائیداد اور مال مویشوں کی دیکھ بھال کے علاوہ پیر صاحب کے مقبرے اور دیگر قبروں کے اعزازی مجاور بھی ہیں۔ ملک صادق آج اپنے بیٹوں اور پوتوں کے ہمراہ پیر صاحب کے مقبرے اور اُن کی دُعاؤں کے زیر سایہ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔

منشی وارث خان



منشی وارث خان گاؤں گکھڑ علاقہ نلہ ضلع اٹک کے کھٹڑ قبیلے کے چشم و چراغ تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ اس گاؤں کے پہلے پڑھے لکھے انسان تھے۔ (میری مراد سکول کی تعلیم سے ہے) اُن کے گھر سے ملنے والے ریکارڈ کے مطابق ان کی پیدائش 1915ء کی ہے۔ والد مرحوم کا نام جعفر خان تھا۔ منشی وارث خان کی تعلیم مڈل جے۔ وی (جونیئر ورنیکلر) تھی جو اگرچہ ایک واجبی تعلیم نظر آتی ہے مگر علمیت کے لحاظ سے ایک سمندر تھے۔ 1938ء سے 1948ء دس سال تک انہوں نے بحیثیت جے۔ وی مدرس کے تحصیل فتح جنگ کے ایک

گاؤں روپڑ کلاں میں تدریس کے فرائض انجام دیئے اور 1948ء سے 1974ء 26 سال تک اپنے ہی گاؤں گکھڑ کے پرائمری سکول میں مدرس رہے۔ اس عرصے میں وہ میرے سمیت ہمارے پانچ بھائیوں کے یکے بعد دیگرے مدرس رہے۔ بحیثیت استاد اور شاگرد اُن کے ساتھ ہماری بہت سے یادیں وابستہ ہیں (جن کا ذکر شاید کسی اور موقع پر ہو جائے) تاہم یہاں پر ہم ان کے پیر صاحب کے ساتھ مراسم کا ذکر کریں گے۔ وہ پیر صاحب کے پانچ بیٹوں کے یکے بعد دیگرے اُستاد رہے تو مراسم کا قائم ہو جانا تو قدرتی تھا۔ تاہم یہ مراسم محبت باہمی احترام اور دوستانہ روابط پر مبنی تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کے مزاج میں علم نے عقل، بردباری اور افہام و تفہیم کی ایسی کیفیت قائم کر دی تھی جو ان کے تعلقات تا حیات قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوئی۔ منشی وارث خان اکثر ہمارے حجرے (بیٹھک) میں تشریف لاتے اور پیر صاحب سے حالات حاضرہ، گاؤں اور علاقے کے واقعات پر گھنٹوں باتیں کرتے۔ اس دوران اگر کوئی دوسرا شخص آ بھی جاتا تو وہ ان کی باتوں میں مخل ہونے کی بجائے توجہ سے سنتا۔ باتوں کے دوران اکثر اوقات موضوعات بحث و مباحثے میں بھی بدل جاتے مگر ان کے لہجوں کو تلخ ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ منشی وارث خان کا مسلکی تعلق اہل تشیع (اثناء عشریہ) سے تھا اور اس لحاظ سے مسلکی مسائل بھی زیر بحث آ جاتے مگر اُن میں بھی کبھی تلخی نہیں دیکھی گئی۔ ملاقاتوں میں گاؤں کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر سیاسی اختلافات بھی زیر بحث آ جاتے مگر منشی وارث خان اپنے قبیلے اور خاندان کی طرف سے ہمیشہ ان کو نہایت خوش اسلوبی سے سلجھا لیتے تھے۔ پیر صاحب تعلیم کے قدر دان تھے اور منشی وارث خان نہ صرف ان کے بیٹوں کے معلم بلکہ پورے علاقے میں تعلیم کے داعی تھے۔ وہ اپنے پرائے کے امتیاز کے بغیر علاقے کے ہر بچے کو تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ تو لامحالہ ان کی دوستی بھی یقینی تھی۔ پیر صاحب کی وفات کے ایک سال بعد 1986ء میں منشی وارث خان بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ آج ان کی معنوی اولاد ہزاروں کی تعداد میں اپنے علاقے اور ملک و قوم کی خدمت میں مصروف عمل ہے۔



سائیں کرم الٰہی مرحوم

سائیں کرم الٰہی مرحوم ایک کامل درویش انسان تھے ۔جو جوانی میں ہی اپنے مرشد کی خواہش پر اپنے آبائی وطن ونی گوجراں نزد ترنول (راولپنڈی) سے اپنا سب کچھ چھوڑ کر موضع باہتر ضلع اٹک کے ایک جنگل میں گوشہ نشین ہوگئے۔اور اپنے مرشد کے حکم پر چلہ کشی شروع کر دی۔ایک غار میں چلہ کشی کے بعد جب آپ باہر آئے تو ایک مشہور واقعہ پیش آیا جوان کے برخوردار جناب نیاز احمد چشتی کی زبانی اس طرح ہے۔

چلہ ختم ہونے کے دن باہر بہت سے عوام الناس بیٹھے تھے۔باہر نکلے تو ایک شخص نے بتایا کہ میں پیر صاحب بسال شریف کا فرستادہ ہوں اور انہوں نے گوشت مانگا ہے۔سائیں کرم الٰہی اُس شخص سے مزید سوال کیے بغیر اندر گئے اور ایک استرا اور رومال ہمراہ لائے اور اپنے جسم سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کر رومال میں رکھ دیئے اور اجنبی شخص کے حوالے کر دیئے۔کہتے ہیں وہ شخص جب واپس مرشد کے پاس پہنچا تو گوشت ان کے حوالے کیا۔مرشد نے اس گوشت کو ایک مخصوص جگہ پر دفن کرنے کا حکم دیا۔کہا جاتا ہے کہ جس جگہ گوشت دفن کیا گیا اُسی جگہ پر آج مرشد کی قبر (مزار مبارک) واقع ہے۔

سائیں کرم الٰہی مرحوم نے چلہ والی جگہ کو آباد کر کے آستانہ قائم کیا۔یہ مٹی کے مکان اور زمین کے اندر غار (بھُرے) کھود کر بنائے گئے تھے، چنانچہ بہت کم عرصے میں لوگوں نے یہاں آکر اُن سے ہدایت حاصل کرنا شروع کر دی۔

سائیں کرم الٰہی پیر صاحب کے گہرے دوست، ہمراز اور غمخوار تھے دونوں کا باہمی آنا جانا رہتا تھا۔سائیں کرم الٰہی ایک سادہ اور درویشانہ زندگی کے عادی تھے۔ہنس مکھ اور دل جُو انسان تھے۔قناعت پسندی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔بچپن میں ہائی سکول باہتر میں دوران تعلیم میں بیمار پڑ گیا تو روزانہ کا پیدل سفر مشکل ہوگیا چنانچہ سائیں کرم الٰہی کی خواہش پر میں ان کے آستانے پر ہفتہ دس

دن کے لیے ٹھہرا اور مجھے بچپن میں ان کی شفیق میزبانی کے دن بھی تک یاد ہیں۔خود پیر صاحب مرحوم بھی ان سے دلی محبت کرتے تھے اور اُن سے ملاقات کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

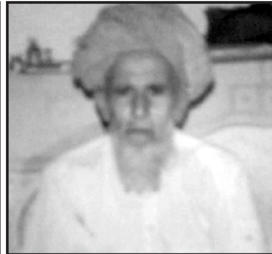
سائیں کرم الٰہی شروع میں بسال شریف کے حضرت خواجہ میر احمد بسالویؒ سے بیعت تھے مگر بعد ازاں آپ سے اسی آستانے کے مرشد حضرت خواجہ اللہ بخش تونسویؒ کے دست حق پرست پر بیعت کر لی اور اُن سے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔حضرت تونسوی کے آپ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور آپ لوگوں کو ان کی برکات سے عمر بھر مستفید کرتے رہے حتیٰ کہ آپ 8 جون 1980ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

__☆☆____☆☆____☆☆__

پیر صاحب مرحوم کے چند عزیز واقارب



سید امام شاہ



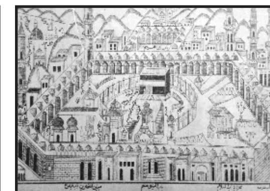
الحاج سید محبوب شاہ

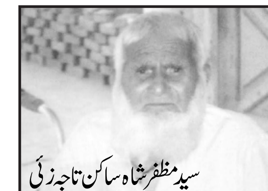


سید نذیر حسین شاہ


نوائے وقت

پیر سید محمد علی شاہ




سید مظفر شاہ ساکن تاجہ زئی


مولانا سید یعقوب شاہ


سید مخدوم شاہ ساکن تتی سَر


24 Nov. 1988

سید محمد علی شاہ المعروف پیر صاحب کا دل عشق رسول سے منور تھا

حضور ﷺ کا ذکر آتا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے

آپ نے حصول علم کے بعد اپنی ساری زندگی تبلیغ دین میں گزار دی

سید محمد علی شاہ کا عرس آج منایا جا رہا ہے

آپ نے خدا اور رسول ﷺ کے احکامات کی پابندی کو دوستی اور دشمنی کا معیار مقرر کیا

نہ مال و زر ہے، نہ جاہ و حشم ہمارا ہے
مگر خدا کی عطا ہے، قلم ہمارا ہے
عَلم کِسی نے کِسی کو دیا تھا خیبر میں
وہ دِن اور آج کا دِن، یہ عَلم ہمارا ہے

افتخار عارف

کتابیات

کتاب کی تالیف کے دوران زبانی اور سینہ بسینہ یاداشتوں کے علاوہ مندرہ ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	تاریخ اشاعت
جواہر اقبال	سید مشتاق حسین بخاری	نومبر 2011ء
تذکرہ پیر سباک	ڈاکٹر سید چراغ حُسین شاہ	1989ء
تذکرہ خواجگان باغدرہ شریف	مقصود احمد راہی	اپریل 2015ء
بضعۃ الاربعین	پیر سید زین الدین بخاری	15 نومبر 1991ء
بضع و اربعین (ترجمہ مجموعہ احادیث)	شارح پیر سید زین الدین مترجم سید محمد ایوب بخاری	2000ء
بیاض	پیر سید محمد علی شاہ	قلمی
سفر نامہ حجاز	پیر سید محمد علی شاہ	قلمی